# مُحبت آگ کی صُورت

ایم سُلطانہ فخر

# محبت کی صورت

ایم سُلطانہ فخر

مکمل ناول

"بی بی۔"

"ہوں۔"

"یہ دودھ ہے تمہارا۔" رکھی نے دودھ کا گلاس میز پر رکھنے کی بجائے اسے ہاتھ میں تھامے تھامے پھر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانی چاہی تو وہ جو ایک ناول کے مطالعے میں غرق تھی اس نے اچٹتی سی نظر رکھی پر ڈال کر کہا۔

"او اچھا یہ گلاس یہاں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دو، میں بعد میں پی لوں گی۔" دودھ کے تصور ہی سے اسے متلی ہونے لگتی تھی مگر تایا اور تائی کا حکم تھا کہ وہ سوتے وقت دودھ ضرور پیے اسی لیے اس نے بے دلی سے کہا۔ مگر رکھی نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر نہیں رکھا بلکہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے کچھ ایسا تاثر پیش کرتی رہی جیسے کچھ کہنے کے لیے موقع تلاش کر رہی ہو یا پھر ہمت باندھ رہی ہو، لیکن وہ تو کلائمکس پر پہنچے ہوئے ناول میں اتنی مگن تھی کہ اسے احساس تک نہ ہوا کہ رکھی ابھی تک اس کے سر پر ہی ایستادہ ہے۔

"بی بی۔۔۔ وہ۔۔۔" رکھی نے ادھر اُدھر دیکھ کر پھر کچھ کہنا چاہا۔ تو وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ رکھی گلاس ٹیبل پر رکھ کر کب کی جا چکی ہو گی۔ اس نے ناول سے توجہ ہٹا کر رکھی کی طرف دیکھا اور گلاس اس کے ہاتھ میں دیکھ کر سخت بیزاری سے بولی۔

"بھئی کہہ دیا ماسی! یہ گلاس یہاں رکھ دو۔ ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا، میں بعد میں پی لوں گی۔" اصل میں تو مطالعے میں خلل پڑ جانے کی وجہ سے وہ چڑ گئی تھی۔

"وہ۔۔۔ بی بی۔۔۔ چنگا دی نئیں پینا۔" رکھی نے پھنسی پھنسی آواز میں آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟" اس نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا اور رکھی اس کے سوال کرنے کے تیکھے سے انداز پر سٹپٹا سی گئی۔

"کیا تمہیں پسند نہیں میرا دودھ پینا ماسی۔" اس کی تیوری یونہی چڑھی رہی کیونکہ پہلے بھی کئی بار جب رکھی کو دودھ لانے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ کچھ ایسا ہی عجیب و غریب سا تاثر دیتی تھی۔

"نئیں نئیں بی بی! ماسی تیرے صدقے ایہہ گل

نئیں۔" رکھی جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھ کر بولی۔

"تو پھر کیا بات ہے؟" اس نے رکھی کی باتوں پر متجسس سی ہو کر پوچھا۔

"وہ جی بس گل تے کوئی نئیں پر توں دودھ نہ پیا کر۔" ماسی گڑبڑا کر بولی۔

"بھئی یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں نہ پیا کروں۔" وہ رکھی کے احمقانہ سے انداز پر جھلا کر بولی۔

"توں بمار (بیمار) جو رہتی ہے نا بی بی۔" رکھی کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بات ٹال رہی ہے۔

"مگر بیماری میں تو صرف دودھ ہی سب سے عمدہ غذا ہوتا ہے۔" وہ قدرے متعجب سے انداز میں بولی۔

"پر ایہہ دودھ نئیں ایہہ دودھ تے الٹا بخار ڈال دیتا ہے۔" رکھی نے عجیب سی صورت بنا کر کہا۔

اس کا لہجہ بھی بہت محتاط تھا۔ شاید دودھ کسی کو نقصان دے گیا ہو گا جو اسے وہم پڑ گیا ہے اس نے دل میں سوچا۔

"ہی ہی یہ خوب منطق ہے تمہاری۔" اسے رکھی کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی۔

مگر ہنسنے پر رکھی نے سہم کر ادھر ادھر دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کی اور پھر محتاط انداز میں اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ کر بہت رازدارانہ اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"ایس دودھ وچ دوائی ملائی جاندی ہے۔ نکی نکی گلیاں (گولیاں) نی تاکہ جہر آہستہ آہستہ اثر کرے۔ ایسی لیے تے تیرے بڈ وچ پیڑ ہوندی اے۔"

"ہیں۔" اسماء کے جیسے بچ مچ کسی نے زہریلا نشتر چبھو دیا ہو۔ وہ اچھلنے کے انداز میں بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماسی! نہیں نہیں یہ بالکل غلط ہے۔" وہ سخت بے یقینی کے عالم میں بولی پھر اس کے جھریوں زدہ چہرے کی طرف غور سے دیکھا مگر سوائے سراسیمگی اور سہم کے اسے کچھ نظر نہ آ سکا۔ تو اس نے رکھی سے پوچھا۔

"کہیں تم گھر میں کسی سے ناراض تو نہیں ہو۔"

"نئیں بی بی! میں نے بھلا کس سے نراج ہونا ہے۔"

"تو پھر کیا تمہیں میرا ادھر اپنوں میں رہنا پسند نہیں۔ یعنی تم چاہتی ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔"

"نہیں نہیں بی بی توبہ توبہ۔" رکھی نے سکلے پیٹتے ہوئے کہا تو اس نے ایک بار پھر بڑی تیکھی اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اللہ رکھی جس کے دادا اور پردادا پشت ہا پشت سے اس کے خاندان میں ملازمت کرتے چلے آئے تھے اور جو خود بھی اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی تھیں پروان چڑھی تھی۔ چڑھتے دریا کی طرح اپنی جوانی اور پھر بیوگی کا طویل زمانہ بھی اس نے اسی گھر میں گزارا تھا۔ یہاں تک کہ حوادث زمانہ کی کڑی دھوپ نے اس کے شب دیجور کی طرح سیاہ بالوں کی ساری سیاہی بھی اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ اس کے سہمے سے چہرے سے نرمی اور خلوص سا جھلک رہا تھا اور گدلائی گدلائی آنکھوں میں ہمدردی اور اپنائیت کے جذبے جھلک مار رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ اس کی ایک ایسی احمقانہ اور بے بنیاد بات پر کس طرح یقین کر لیتی جو اس نے بڑی رازداری برت کر کہی تھی۔

کس دل سے اور کیونکر اعتبار کر لیتی۔

جب کہ تایا اور تائی ہی نہیں بلکہ ان کے چاروں بچے بھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔

اور خصوصاً" تایا اور تائی نے تو اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا تھا۔ اس کی معمولی سے معمولی بات کا بھی اس قدر خیال رکھتے تھے کہ اگر اسے ایک ذرا سی چھینک بھی آ جاتی تو سب پریشان ہو اٹھتے۔

زبردستی اسے ٹھونس ٹھونس کر کھانا کھانے پر مجبور کیا جاتا۔

کھانے بھی اس قدر مقوی اور مرغن کہ اس کا وزن چند ماہ ہی میں دس پونڈ بڑھ گیا تھا۔

اور اس پر ہی بس نہیں ہوتا تھا۔

رات کو تائی اماں زبردستی اسے دودھ کا جائنٹ سائز گلاس بھی پلواتی تھیں۔



جب کہ دودھ سے وہ اس قدر الرجک تھی کہ اس کے تصور ہی سے اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی تھی۔

مگر ایک تو تائی اماں کی بے پایاں محبت اور دلار بھرے اصرار کی وجہ سے اور دوسرے اس وجہ سے کہ دودھ کا گلاس تائی اماں بہ نفس نفیس خود لے کر آتی تھیں اور خود اپنے ہی ہاتھ سے پلاتی تھیں وہ انکار نہیں کرتی تھی۔ البتہ ایک آدھ بار ہی ایسا اتفاق ہوا تھا کہ انہوں نے رکھی کے ہاتھ اس کا دودھ بھیجا تھا' وہ بھی مجبوری کے تحت کہ ایک دفعہ انہیں کسی تقریب میں جانا تھا اور ایک مرتبہ ان کے پاس ان کے میکے سے کوئی آیا ہوا تھا اور ایک مرتبہ بہت شدید قسم کا فلو ہو جانے کی وجہ سے وہ بستر سے نہ اٹھ سکی تھیں۔

مگر آج تو تائی اماں گھر میں تھیں اور بالکل بخیرو عافیت تھیں۔ کوئی مہمان یا ملنے والا بھی نہیں آیا ہوا تھا۔

اور اب انہوں نے رکھی کے ہاتھ اس کا دودھ بھیجا تھا تو رکھی نہ جانے کیا اول فول بک رہی تھی۔

"کہیں یہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے سٹھیا تو نہیں گئی ہو ورنہ یہاں کی پرانی نمک خوار ہے بلکہ پیداوار۔ سارے بچوں کو اسی نے کھلایا ہے۔ اور باتیں ساری نمک حرامی کی کر رہی ہے۔ تایا اور تائی کی بے اندازہ اور بے پایاں محبت کا خیال آیا تو اسے تاؤ آ گیا پھر بھی خود پر بہت ضبط کر کے بولی۔

"اچھا ماسی! یہ بتاؤ کہ میرے دودھ میں یہ زہریلی گولیاں کون ملاتا ہے۔"

"نئیں نئیں بی بی یہ میں نئیں بتاؤں گی کبھی بھی نئیں۔" رکھی ہولنے کے انداز میں تھوڑی سی پیچھے سرک کر بولی۔

"اچھا تم نہیں بتاؤ گی تو میں خود جا کر تائی اماں سے پوچھ لوں گی۔" وہ گویا اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

"نئیں نئیں بی بی تجھے خدا واسطہ تو ملکانی سے کچھ نہیں پچھنا۔" رکھی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بڑے ملتجی سے انداز میں بولی۔

"تو پھر جب تم نے مجھے اتنا بتا دیا ہے تو یہ بھی بتا دو۔ تم نے تو ایک نیکی کا کام کیا ہے نا ماسی! میرا مطلب ہے تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی ہے تو میں بھی تمہاری بات کو اپنے سینے میں چھپائے رکھوں گی چلو اب تو بتا دو ماسی۔" اسے رکھی کے سفید سر اور جڑے ہوئے ہاتھوں پر ترس آ گیا تو وہ ذرا نرم پڑ کر بولی اور تب ماسی کچھ دیر تک تو شاید یہی فیصلہ کرنے میں لگی رہی کہ بتائے یا نہ بتائے پھر اس نے بیڈ کی پٹی کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"جے ملکانی ہے نا' اسی کی کارستانی ہے ساری۔" اور تائی اماں کا نام سن کر وہ گم صم سی رکھی کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"اور وہ جے تیرے گھار وچ جیہڑا بندہ کود اسی جے چور نئیں اپنا چھوٹا ملک سی۔" اور اس انکشاف پر اسے اتنے زور کا شاک لگا کہ وہ اچھل سی پڑی۔

"وہ۔۔۔ وہ تیمور تھے؟" اس نے بے یقینی سے چور چور ہوتی لڑکھڑاتی سی آواز میں پوچھا۔

"آہو جی وہی تھے۔" رکھی نے اپنا سفید تاروں سے منڈھا سر بڑی تیزی سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ بھلا کس لیے یوں چوروں کی طرح رات کو میرے گھر میں کودے تھے۔"

"جے تو مینوں معلوم نہیں پر کوئی گڑبڑ جرور ہے۔" رکھی نے بدستور سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"گڑبڑ ہے۔" اس نے بے یقینی کے بھنور میں ہچکولے کھاتے ہوئے ڈوبتے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"آہو! یہ پیسے کا لوبھ وڈا کھراب ہوندا اے بی بی! ملکانی تو ہے ہی تیرے کھلاف پر چھوٹا ملک بھی تیری جائیداد پر دانت لگائے ویٹھا ہے۔" آدھی پنجابی اور آدھی اردو میں رکھی نے مزید انکشافات کیے تو اسے اپنے اندر ایک دم ہی زبردست توڑ پھوڑ ہوتی محسوس ہوئی اور تلملاتے ہوئے انداز میں بولی۔

"اف! یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماسی! کیوں کہہ رہی ہو' آخر تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی جب کہ نمک تو تم ان لوگوں کا کھاتی رہی ہو' اسی گھر میں پلی بڑھی ہو کہیں یہ پٹی تمہیں ہمارے کسی دشمن نے تو نہیں پڑھائی اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ اتنی سنگین

بات کہنے کا انجام کیا ہو گا۔"

"ہاں ہاں معلوم ہے پر تیرا پیو بھی میرا مالک سی۔ بیل کل شہزادوں جیسا۔ پر ملکانی تے اس کی جند جان دی دشمن سی۔ اوس نوں گھار سے نکلوا کے ہی چھڈیا تینوں تو پتا ہو گا نا سب۔"

"نہیں۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کا شوق ہی ہے بلکہ میں تو یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو۔" اس نے اپنی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ڈال کر کہا۔

"توں میری جیراں ورگی ہے نا۔۔۔ میری جیراں دی تیرے جیسی سونی اور چٹی سی، ہور فیر میں نے تیرے پیو کا بھی نمک کھایا ہے مینوں تیری جوانی پر وڈا ترس آتا ہے۔ تیری جان خطرے میں ہے نا۔۔۔ ایسا کر تو لاہور چلی جا۔۔۔" رکھی نے مشورہ دینے کے سے انداز میں بڑی دردمندی سے کہا۔ لیکن اسماء کو کسی طور بھی اس کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ یقین کی بنیادیں تو اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان پر کھڑی کی جانے والی عمارت میں بڑے بڑے ہلاکت خیز زلزلے ذرا سا شگاف بھی نہیں ڈال سکتے اور اسے تو اپنے تایا تائی اور تایا زادوں پر اور خصوصاً" تیمور پر اندھا یقین تھا پھر وہ بھلا کس دل سے رکھی کی بے سروپا باتوں پر یقین کر لیتی۔ وہ تو خود پر بہت ضبط کر کے رکھی کو سوالات کر رہی تھی۔ رکھی نے اسے لاہور چلے جانے کا مشورہ دیا تو وہ تلملا ہی اٹھی اور رکھی کو بے نقط سنانا ہی چاہ رہی تھی کہ دفعتاً" دروازے پر پڑا پردہ زور سے کھسکا کر اس کی تائی اماں اندر داخل ہوئیں۔ ان کی نظر پہلے سائیڈ ٹیبل پر پڑے دودھ کے گلاس پر پڑی اور پھر رکھی پر اور ان کی تیوری پر ان گنت بل پڑ گئے۔

"ہے خصمونو کھانے تو یہاں بیٹھی کیا دکھڑے رو رہی ہے۔ چل دفعان، اٹھ یہاں سے۔" انہوں نے رکھی کے عین سر پر پہنچ کر دانت پیس کر کچھ اس طرح کہا کہ بس مارنے کی کسر ہی رہ گئی اور رکھی جس کا رنگ ان کی آواز سن کر فق ہو گیا تھا۔ بڑی رحم طلب نظروں سے اسماء کی طرف دیکھتی، لرزتی کانپتی بیڈ کی پٹی کا سہارا لے کر اٹھی اور مجرموں کی طرح جھکا کر باہر جانے لگی تو تائی اماں یعنی ناصرہ بیگم پھر اپنے اسی لب نسے کے عالم میں بولیں۔

"ہائے تو نے تو اسماء بیٹی کو دودھ بھی نہیں پلوایا، کرموں جلیے آخر تو کر کیا رہی تھی۔" تو رکھی نے جاتے جاتے رک کر کہا۔

"کچھ وی نئی ملکانی جی دوہی بی۔"

"چل چل دفع ہو۔ آئندہ اگر یوں بیٹھ کر باتیں مٹھاریں تو میں تجھے بھی تیری جیراں کے پاس پہنچا دوں گی۔" ان کی دھتکار میں ایک دھمکی ایک غراہٹ سی شامل تھی۔ رکھی گھبرا کر باہر نکل گئی۔ اسماء کو اپنی تائی کا یہ انداز اور لب و لہجہ سخت ناگوار گزرا۔ دل میں تو پہلے ہی شک و شبہات کی کھدبد ہو رہی تھی۔ اس نے تیکھے سے انداز میں تائی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں کیا رکھی کو مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہیں تائی اماں۔" سوال واقعی ٹیڑھا سا تھا۔ ناصرہ بیگم سٹ پٹا سی گئیں مگر پھر فوراً" سنبھل کر بولیں۔

"نہیں نہیں بیٹا! بھلا اجازت کا کیا سوال؟ بس یہ رکھی ذرا سٹھیا گئی ہے ہمیشہ اونگی بونگی ہی بولتی ہے اور الٹی سیدھی لگانے کی تو اس کی پکی عادت ہے۔ اپنی اسی عادت کی وجہ سے خاندان برادری میں جھگڑے بھی کروا چکی ہے۔ میں تو اس کی اس عادت سے عاجز آ چکی ہوں مگر کیا کروں اتنی پرانی ملازمہ ہے کہ اسے گھر سے نکالنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔" تائی نے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

رکھی تائی کے یہاں ہی پلی بڑھی ہے اور ان سے عمر میں بھی بہت بڑی ہے۔ ظاہر ہے وہی اس کی عادتوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں گی اسماء کے دل نے تائی کی باتوں پر قائل ہو کر سوچا۔ جی چاہا تائی کی بات کی تائید میں انہیں اصل بات بتا دے مگر تبھی رکھی کی وہ رحم طلب نظریں یاد آ گئیں اور زبان تک آئی بات کو پلٹ کر تھوڑا سا مسکرا کر بولی۔

"اچھا۔ مگر وہ تو مجھ سے کسی جیراں کا ذکر کر رہی تھی جو شاید مجھ سے بہت مشابہ تھی۔"

"ہے ہے ہزار قرآن درمیان۔ رکھی کے منہ میں خاک، وہ بھلا تم سے مشابہ کیوں ہوتی۔ وہ رکھی کی



سانولی اور مرگھلی سی لڑکی جو شوہر کے مظالم سہتے سہتے ٹی بی کا شکار ہو کر مر گئی۔ اس کم بخت رکھی کو وہم نہیں آیا تمہیں اس سے ملانے پر۔" ناصرہ بیگم نے دہل کر کہا تو اسماء نے رکھی کی باتوں میں آ کر ان کی طرف سے مشکوک ہو جانے پر خود کو دل ہی دل میں ملامت کی۔

"وہم کیوں آتا تائی اماں! وہ جیراں کی ماں ہے اور ہر ماں باپ کو اپنی بدصورت سے بدصورت اولاد بھی خوب صورت ہی لگتی ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں وہ حبشی کی ٹوپی والا معاملہ ہوتا ہے نا اور جیراں تو اس کی اکلوتی بیٹی تھی، رکھی کا شوہر تو ٹی بی کا پرانا مریض تھا۔ شادی کے دو تین سال بعد ہی مر کھپ گیا تھا۔ اصل میں اس نچلے طبقے میں جہالت زیادہ ہوتی ہے نا رکھی کے ماں باپ کو معلوم تھا کہ داماد ٹی بی کا مریض ہے پھر بھی رکھی کو اس کے سر منڈھ دیا۔" ناصرہ بیگم اس کی بات پر قائل ہو کر تاسف سے بولیں۔

"جی ہاں! یہ بھی ایک زبردست المیہ ہے۔" اسماء نے ایک سرد سی آہ بھر کر کہا۔

"ہاں وہ تو ہے مگر کیا ابھی تمہارا سونے کا ارادہ نہیں۔" تائی اماں نے پوچھا، وہ ابھی تک کھڑی ہی تھیں۔

"بس یہ ناول تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ اسے ختم کرتے ہی سو جاؤں گی۔" اسماء نے کہا۔

"اب درد تو نہیں محسوس ہو رہا تمہیں۔" ناصرہ بیگم نے مزید سوال کیا۔

"جی نہیں تائی اماں! اس وقت تو بالکل محسوس نہیں ہو رہا۔"

"دوا تو پابندی سے کھا رہی ہو نا۔"

"لیجیے آپ اور تیمور بھائی خود ہی تو کھلاتے ہیں۔" اسماء نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ورنہ تم تو ہو ہی سدا کی لاپروا۔ اب یہ دودھ ہی کو لے لو زبردستی پلانا پڑتا ہے ورنہ تم خود تو کبھی پیو ہی نہیں۔" ناصرہ بیگم نے دلار بھرے انداز میں کہا اور پھر جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے دودھ کے گلاس کو انگلیوں سے چھو کر دیکھا اور بولیں۔

"ارے یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے لیکن ابھی تو گنگنا ہے تم پی سکتی ہو۔" انہوں نے گلاس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں لیکن ابھی میرا دل دودھ پینے کو نہیں چاہ رہا۔" وہ اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"اے لو تمہارا دل تو کبھی کچھ چاہتا ہی نہیں' وہ بھی خاص طور سے دودھ پینے کو۔ خیر اگر دل نہیں بھی چاہ رہا تو ناک بند کر کے غٹا غٹ پی جاؤ چلو شاباش۔" وہ اصرار کرنے کے سے انداز میں بولیں۔

"نہیں نہیں' ابھی نہیں تائی اماں! آپ پلیز یہ گلاس میز پر رکھ دیں۔ میں یہ ناول ختم کرنے کے بعد پی لوں گی۔ اصل میں دودھ پینے کے لیے مجھے خود کو بڑی مشکلوں سے آمادہ کرنا پڑتا ہے۔" اسماء نے ہنستے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"مگر سفید چیز کھلی نہیں رکھتے' وہ بھی خصوصاً" دودھ سے بنی چیزیں۔" ناصرہ بیگم بولیں۔

"ہائے نہیں تائی اماں! یہ تو سارے توہمات ہوتے ہیں انسان کے۔ چلیں ایسا ہی وہم ہے آپ کو تو میں اسے کسی چیز سے ڈھانپے دیتی ہوں۔" گلاس تائی کے ہاتھ سے لینے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"اچھا!" ناصرہ بیگم ڈھیلے لہجے میں بولیں۔ "مگر انہوں نے گلاس اس کے ہاتھ میں نہیں دیا۔

"تم تو کچھ دیر بعد پیو گی نا۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ گرم کروا کے تمہیں بھیجے دیتی ہوں۔ ٹھنڈا دودھ نقصان دہ ہوتا ہے۔" بظاہر تو ناصرہ بیگم نے اس کے بھلے کے لیے کہا تھا مگر ان کے انداز میں گھبراہٹ پنہاں تھی۔ لازماً" اسماء کے دل میں ایک کھٹک سی ہونے لگی۔ پھر بھی اس نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ آپ زحمت نہ کریں تائی اماں۔ بس اتنا ہی گرم کافی ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تم تو بدھو ہو' لو بھلا اس میں زحمت کی کیا بات ہے گرم کر کے کسی کے بھی ہاتھ بھجوا دوں گی۔" ناصرہ بیگم بولیں اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں اور وہ جسے خود ہی اب انہیں روکنے یا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں

نظر آ رہی تھی کچھ دیر تو دل میں ہوتی شکوک و شبہات کی کھٹک پر وہ قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر کسی خیال سے دوپٹہ سینے پر پھیلا کر اٹھی اور دبے دبے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

باہر تایا کے خاصے وسیع قدیم طرز پر بنے گھر میں نیم تاریکی میں لپٹا سناٹا کچھ پراسرار سا لگ رہا تھا۔ اصل میں رات کے ساڑھے دس بھی تو بج رہے تھے اور ٹی وی پر کوئی لیٹ نائٹ پروگرام بھی نہیں تھا' شاید اس لیے سب دس بجے سے ہی سو گئے تھے کیونکہ سیما' صبا اور تایا ابا یعنی ملک جواد علی کے کمروں کی بتیاں بند تھیں البتہ عقبی برآمدے میں جو اسماء کے کمرے کے قریب ہی تھا ہلکے پاور کا بلب ضرور جل رہا تھا یا پھر تیمور کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اسماء کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس ارادے یا نیت سے اس وقت کمرے سے باہر نکلی ہے بس کسی انجانی سی جستجو نے ہی اس لمحے اسے کمرے سے باہر نکلنے پر مجبور کیا تھا۔

کوریڈور کھلا ہوا تھا اور چھت کا پنکھا چلنے کی وجہ سے حرکت کرتا ہوا پردہ بار بار اوپر اٹھ رہا تھا اس لیے تیمور کے کمرے میں جلتی روشنی کوریڈور کے دوسرے سرے سے ہی نظر آ رہی تھی اور تیمور کے کمرے میں روشنی دیکھ کر یکبارگی اسماء کے دل کی دھڑکنیں از خود رفتہ سی ہو گئی تھیں۔ تیمور سے اس کی قلبی وابستگی ہی اتنی زبردست تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ تیمور کو ہی وہ سب کچھ بتا دے جو اس نے رکھی کی زبانی سنا ہے۔ رکھی کی شامت ضرور آئے گی مگر اس کی باتوں نے میرے اعتماد کی مضبوط دیواروں میں جو ایک لرزش سی پیدا کر دی ہے کم از کم وہ تو ختم ہو جائے گی اور پھر میں تیمور کو سختی سے منع کر دوں گی کہ وہ کسی کے سامنے رکھی کا نام نہ لیں۔ رکھی نے تو ان کو بھی اس معاملے میں ملوث کیا ہے مگر ابھی میں یہ بات تیمور کو نہیں بتاؤں گی۔ یہی سب سوچتی اسماء دبے دبے محتاط قدموں سے تیمور کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ دھڑکا بھی برابر لگا ہوا تھا کہ تائی اماں اچانک کہیں سے نکل کر سامنے نہ آ جائیں مگر جوں ہی وہ تیمور کے کمرے کے دروازے تک آئی اندر سے آتی ناصرہ



بیگم کی آواز نے اسے وہیں ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تیمور سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ واپس چلی جائے اور وہ جانے کے لیے پلٹ ہی رہی تھی کہ تبھی تیمور کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"جب اس نے کہہ دیا تھا کہ بعد میں پی لے گی تو پھر بھلا یہ گلاس اٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔" تیمور نے آہستہ سے کہا تھا مگر اس کی مردانہ بھاری سی آواز خاصی واضح تھی۔

"میں تو اس لیے اٹھا لائی کہ اگر دیر سے پینے میں مزا بدل جاتا تو۔" تائی نے کہا۔

"مگر اب گرم کرنے سے تو یہ پھٹ جائے گا۔ کیا گھر میں اور دودھ نہیں ہے۔" تیمور نے جھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"نہیں' اگر ہوتا تو پھر میں تمہارے پاس کیوں آتی؟" تائی نے جواباً" کہا۔

"واہ! آپ نے تو سارا کام ہی خراب کر دیا۔ آج تو اسے دودھ پلوانا بہت ضروری تھا۔ میں نے دوا کی مقدار تھوڑی سی بڑھا دی تھی۔" تیمور بگڑے بگڑے سے انداز میں بولا۔

"تو پہلے بتایا ہوتا۔"

"پہلے اور پیچھے کیا۔ آپ روز ہی اسے دودھ پلاتی ہیں' اس لیے میں نے بتانا ضروری نہ سمجھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا۔ ایک تو وہ دودھ سو نخروں سے پیتی ہے۔ منہ دکھ جاتا ہے میرا کہہ کہہ کر' دوسرے بالکل ہی گھٹی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اب تو پیٹ کا درد بھی جاتا رہا۔" ناصرہ بیگم نے شاید بیٹے کی خفگی کے خیال سے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے رکھی کے ہاتھ دودھ بھیجا تھا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سلو پوائزننگ کرنے میں خون آہستہ آہستہ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے اور اعضاء بھی بتدریج متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر بہت سخت جان بھی ہوئی تو زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ماہ اور کھینچ لے گی ورنہ پندرہ دن۔" تیمور اپنی بات کہہ کر ہنسا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک ڈیڑھ ماہ کی مدت تو بہت ہوتی ہے اگر کسی کو معلوم ہو گیا یا اسے شک ہو گیا تو۔" ایک ڈیڑھ ماہ کی مدت ناصرہ بیگم کو بہت طویل لگی۔ انہوں نے اندیشوں میں گھر کر کہا۔

"اب فرشتے تو نہیں آئیں گے کسی کو یا اسے خبر کرنے۔ ہاں البتہ آپ کی باتوں اور حرکات سے اس کا امکان یقینی ہے۔" تیمور چڑ کر بولا۔

"اے لو' مجھے کیا ایسا باؤلا سمجھ رکھا ہے۔ ہاں اتنا ضرور بتائے دیتی ہوں کہ یہ کام اب میرے بس کا نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے تم اپنے ہاتھ میں لے لو۔" ناصرہ بیگم بولیں۔

"نہیں' نہیں امی جان! میں تو اس معاملے میں بالکل بودم ہی ثابت ہوں گا کیونکہ نامعلوم کیوں اس کے سامنے میں خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ چنانچہ اس بات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ تنگ آ کر اس سے صاف صاف کہہ دوں کہ تمہیں آہستہ آہستہ زہر دیتے دیتے تنگ آ گیا ہوں لہٰذا اب بہتر یہی ہے کہ تم زہر کی یہ ساری مقدار اکٹھی ہی پھانک لو۔" اپنی بات کہہ کر تیمور زور زور سے ہنسنے لگا۔

"چل چل زیادہ بزدلی نہ دکھا۔ یہ ہنسی مخول کی بات نہیں بلکہ بہت ہی سنجیدہ اور پیچیدہ معاملہ ہے۔" ناصرہ بیگم بیٹے کو بات ہنسی میں اڑاتا دیکھ کر چڑ سی گئیں۔

"جی ہاں جی ہاں اور سخت سنگین اور مجرمانہ بھی مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہی ہوتا رہنے دیجیے۔ اس میں تغیر اور تبدیل کرنے کی کوشش کریں گی تو بات چھپی نہ رہ سکے گی۔"

"اچھا اچھا چل زیادہ باتیں نہ بنا' آج تو خیر اس چڑیل نے سارے دودھ کا بیڑا ہی غرق کر دیا لیکن کل' کل تو اس کا منہ چیر کر زبردستی پلوا کے رہوں گی۔" تائی نے اس طرح کہا جیسے قصہ کوتاہ کرنے کی غرض سے کہہ رہی ہوں اور وہ جو سانس روکے اور دم سادھے بے حس و حرکت سی کھڑی یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ دماغ میں بگولے سے اٹھ رہے تھے۔ پیروں تلے سے بار بار زمین کھسکتی

محسوس ہو رہی تھی اور دل کی بستی تہہ و بالا ہوتی لگ رہی تھی۔

کیونکہ اندھے اعتماد کی گہری بنیادوں پر قائم مضبوط عمارت ہلاکت خیز زلزلوں کی زد میں آکر آن کی آن میں ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور خود اس کا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ قدم اٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی مگر پھر بھی اپنی موجودگی کو تائی اور تیمور کی نظروں سے چھپانے کی خاطر۔ نہ معلوم کس طرح اور کیونکر وہ لہراتے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچ ہی گئی اور خود کو کسی ہارے ہوئے زخموں سے چور چور انسان کی طرح بیڈ پر گرا دیا۔ ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔

بس رکھی کے کہے یہ الفاظ کہ دودھ میں دوائی ملائی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی گولیاں تاکہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرے کسی بازگشت کی طرح کانوں میں گونج رہے تھے۔ اف تو تمہیں ٹریپ کیا گیا ہے اسماء اف کس خوب صورتی اور ترکیب سے تمہارے گرد مکر و فریب کا جال بچھایا گیا ہے۔ پھر اسماء کی آنکھوں کے پردے پر جو کچھ ہوا تھا اس کی ایک فلم سی اترنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥
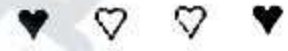
"زریں۔"

"جی۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم نے اسے اندھیرے میں رکھ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کسے۔"

"اپنی اسماء کو بھئی۔"

"ہاں مگر کیا کیا جاتا۔ مصلحت کا تقاضا ہی یہی تھا۔"

"نہیں، میں نے کسی مصلحت کی وجہ سے تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

"تو پھر۔"

"بس کچھ خیال ہی نہیں آیا اور یہی مجھ سے بڑی چوک ہوئی مگر کم از کم تمہیں تو بتا دینا چاہیے تھا۔"

"مجھے۔"

"ہاں ہاں حرج ہی کیا تھا، آخر تم ماں ہو اس کی۔"

"ہاں ماں ضرور ہوں لیکن پہلے آپ کی بیوی ہوں۔"

"واہ یہ کیا بات ہوئی؟"

"میرا مطلب ہے، میں پہلے بھی بتانے کے حق میں تھی نہ اب ہوں۔"

"لیکن کیوں آخر کس وجہ سے؟"

"کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ اسماء کے کھوٹ سے پاک صاف اور شفاف دل میں بغض و عناد کے بیج بوؤں۔ بچوں کے دل بچپن سے ہی برے ہو جاتے ہیں تو پھر نسل در نسل ایسی منافرتیں اور مخالفتیں جنم لیتی ہیں کہ پھر ان کا کوئی توڑ ہی باقی نہیں رہتا۔"

"ہوں مگر ادھر تو بیج ہی کیا پورا جنگل اگایا ہوگا بغض و عناد کا۔"

"ادھر والوں سے مجھے کیا غرض، میں تو صرف اپنے متعلق بہت گہرائی سے سوچنے کی عادی ہوں اور پھر جس راہ پر چلنا تھا ہی نہیں اس کے کوس گننے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی ہمارا ماحول، رہن سہن، نظریات حتیٰ کہ مصروفیات بالکل جداگانہ ہیں۔ بھلا اتنی مہلت ہی کہاں ملتی کہ بیتی ہوئی باتوں کو دہرایا جاتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے زرین گل! لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ بغض و عناد کے بیجوں سے ہی تعارف کی ابتدا کی جاتی۔"

"نہیں بالکل ضروری نہیں تھا بلکہ خود مجھے بھی پسند نہیں تھا لیکن آپ کو اسماء کی فطرت اور طبیعت کا تو بخوبی اندازہ ہو گا کہ وہ ہر بات کو اس کی تہہ میں اتر کر جانچتی اور پرکھتی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوتا کہ محض ناچاقی کی وجہ سے تمہارے ابو اپنے سگوں سے ترک تعلق کر بیٹھے تھے اور اس طرح کہ بیس بائیس برس گزر جانے کے بعد بھی تعلق کی یہ کٹی ہوئی ڈور جوڑی نہ جا سکی۔ اول تو یہ انکشاف ہی اس کے لیے بڑا بھاری ثابت ہو گا کہ اس دنیا میں ہمارے علاوہ اس کے کچھ سگے بھی موجود ہیں۔ دوسرے ہم دونوں جو شروع سے اسے اندھیرے میں رکھے ہوئے ہیں اس کی نظروں سے گر جائیں گے اور سب سے



پہلے تو وہ یہ پوچھتی کہ آخر اس قدر زبردست ناچاقی کی وجہ کیا تھی تو کیا میں اسے یہ بتاتی کہ غیر خاندانی ہونے سے زیادہ تمہارے ابو کے اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر لینے پر تمہارے تایا اور تائی نے میری کتے کی سی اور کر کے رکھ دی تھی نہ صرف یہ بلکہ جائداد میں سے تمہارے ابو کا حصہ غصب کر لینے کی وجہ سے انہوں نے تمہارے ابو کو جان سے مار ڈالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو زندگی تھی جو بچ گئے تھے اور اسی وجہ سے اپنی جائداد پر لعنت بھیج کر ہمیشہ کے لیے ان لوگوں سے قطع تعلق کر بیٹھے۔"

"اوہو۔۔۔ اوہو بھئی تم تو ایک دم برس ہی پڑیں۔ میں خود بھی یہ ناں کہنا چاہتا تھا کہ ان ساری باتوں کا علم اسماء کو ہو۔"

"تو پھر آپ اور کیا بتاتے؟"

"صرف اسی قدر کہ اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر لینے کی وجہ سے میں نے اپنوں کی اتنی زبردست ناراضگی مول لی ہے۔"

"واہ یعنی مجھے بیٹی کی نظروں میں گراتے۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ پڑھی لکھی اور باشعور ہے بلکہ بے حد زیرک اور سمجھدار اور پھر زمانے کے ساتھ ساتھ طور طریق اور نظریات بھی بدل گئے ہیں وہ الٹی تم سے ہمدردی ہی محسوس کرتی۔"

"مگر آج یہ ایک دم ہی آپ کو کیا خیال آگیا جب کہ ان لوگوں نے تو آج تک پلٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی۔"

"نہیں بیچ میں کوشش تو بہت کی تھی بھائی جان نے تعلقات استوار کرنے کی لیکن میں نے ہی گوارا نہیں کیا۔"

"تو پھر اب کیسے کر لیا؟"

"اپنی حالت کے پیش نظر اور یہ خیال بھی مجھے آج نہیں اسی روز ہی آگیا تھا جب مجھ پر دل کا پہلا دورہ پڑا تھا۔"

"ارے نہیں وہ دل کا دورہ نہیں تھا زبردست قسم کا ڈپریشن ہو گیا تھا آپ کو۔"

"یوں خوب صورت بہلاوے دے کر حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش تو نہ کرو۔ میری ای سی جی رپورٹ تو آج بھی میری اسی بیماری کی گواہ ہے اور اب برس سوا برس بعد پچھلے دو تین دن سے پھر میری وہی کیفیت ہو رہی ہے۔"

"ہونہہ! آپ کو تو خوامخواہ وہم ہو گیا ہے۔"

"نہیں، یہ میرا وہم نہیں بلکہ حقیقت ہے جس سے تم بھی بخوبی آگاہ ہو پھر ان طفل تسلیوں سے فائدہ۔"

"خوا! آپ خدارا ایسی مایوس کن باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ میرا نہیں تو کم از کم اسماء کا ہی خیال کر لیں۔ وہ ۔۔۔ وہ بے چاری۔"

"اسی خیال سے تو کہہ رہا ہوں کہ اسے سب کچھ بتا دو کیونکہ میرا کوئی بھروسہ نہیں جانے کب بلاوا آجائے۔"

"اف نہیں نہیں دشمنوں کا بلاوا آئے۔ آپ۔۔۔ آپ یہ کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو خدانخواستہ کچھ نہیں ہو گا۔" بلکہ۔۔۔ بلکہ آپ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رہیں گے۔"

"تم اس وقت سخت جذباتی ہو رہی ہو زرین! ورنہ جو حقیقت ہے اس سے تم لاعلم نہیں ہو اور میری خواہش ہے کہ اب تم اسماء کو سب کچھ بتا دو تاکہ میرے بعد کسی غلط پیرائے میں اسماء کے کانوں تک یہ باتیں نہ پہنچ سکیں اور پھر میں نے وہاں اپنی علالت کی اطلاع بھی بھیج دی ہے بہت ممکن ہے کہ بھائی جان خود ہی آجائیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے آنے سے پیشتر ہی اسماء کو ہر بات سے آگاہ کر دیا جائے۔" مگر جواب دینے کے بجائے زریں ہونٹ بھینچ کر اپنے بدلیوں کی طرح امنڈتے آنسوؤں کو روکنے میں کوشاں رہیں۔

"دیکھو یوں میرے جیتے جی آنسو نہ بہاؤ زریں بلکہ میرے بعد بھی نہیں رونا۔ ساری عمر تم نے جس طرح پامردی اور بہادری سے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے جس خوش اسلوبی، فرض شناسی اور خلوص سے اس تین نفوس کے مختصر ترین گھرانے کو بہشت زار بنا رکھا ہے اسی استقلال اور بہادری سے اس نازک ترین

صورت حال کا بھی مقابلہ کرو۔ بیٹی کی نظروں سے گر جانے کی فکر نہ کرو کیونکہ تمہارا ظاہر اور باطن بالکل صاف ہے اور پھر اس میں صرف تمہاری ذات ہی ملوث نہیں۔"

"نہیں نہیں فواد! آج کل میرا دماغ ٹھکانے نہیں۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں بتایا جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خود ہی اسے بتادیں۔" زریں گل نے پلکوں کا حصار توڑتے ہوئے اشکوں کے ریلے کو اپنے دوپٹے کے آنچل میں جذب کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر میں ہی بتادوں گا اسے۔" فواد صاحب نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ان کی طبیعت واقعی دو تین روز سے خراب تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق تو کوئی تشویش ناک بات نہ تھی بس تھوڑا ڈپریشن سا تھا لیکن وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھے اور دل کی ادلتی بدلتی کیفیتوں سے اندازہ لگا چکے تھے کہ درحقیقت یہ دوسرے اٹیک کا پیش خیمہ ہے۔

"مگر وہ تو اس وقت کالج گئی ہوئی ہو گی۔" انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں۔ مگر ایک گھنٹے کے اندر اندر آتی ہی ہو گی۔" زریں نے کہا اور پھر شوہر کے لیے سوپ لینے کی غرض سے اٹھ کر جانے لگیں تو انہوں نے کہا۔

"اتنی دیر سے مسلسل باتیں کرتے رہے ہیں اب آرام کیجئے پھر فرصت سے منی کو سب کچھ بتادیجئے گا۔"

"ہاں دیکھو اتنی مہلت ملے گی بھی یا نہیں۔"

"افوہ! پھر وہی باتیں۔ کیا آپ کو میرا دل دکھانا بہت اچھا لگتا ہے۔" زریں نے انہیں پیار سے گھور کر دکھی انداز میں کہا۔

"اچھا اچھا بھئی معافی۔" انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ہونہہ! بس فوراً ہی اترانے لگتے ہیں۔" زریں گل نے قدرے اٹھلا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں اور فواد باہر جاتی ہوئی مہر و وفا کی دیوی کو بڑی آزردگی سے دیکھتے رہے پھر ان کا خیال اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کی طرف پلٹ گیا جو ایک مقامی کالج میں انٹر کی طالبہ تھی۔ اب میں اسماء کو کس طرح بتاؤں گا کیونکر بات کی ابتدا کروں گا۔ کیا دل و جان کی مالک اپنی زریں کے قصے سے ابتدا کروں یا اپنی شادی کے ذکر سے نہیں نہیں میں اسے ہر بات بتادوں گا۔ میں اپنی عزیز از جان بچی کو کسی بات سے لاعلم نہیں رکھوں گا۔ نامعلوم میری آنکھ بند ہونے کے بعد اسے کن حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ میں زریں کی طرح احتیاط اور نزاکتوں کا قائل نہیں ہوں اور یہی سوچتے سوچتے وہ پچیس برس پیشتر کے زمانے میں پہنچ گئے۔

ان کے والد کا آبائی وطن جالندھر تھا۔ ان کا شمار اونچے درجے کے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کی جائیدادیں اور زمینیں صرف جالندھر میں ہی نہیں تھیں بلکہ پٹیالہ میں بھی ان کی خاصی وسیع جائداد تھی جنہیں ان کے چھوٹے بھائی اللہ نواز نے سنبھال رکھا تھا۔ ملک اللہ یار کی کل تین اولادیں تھیں۔ بڑا لڑکا ملک جواد اس سے چھوٹی بہن اور تیسرے نمبر پر فواد۔

ان دنوں فواد بی اے کے طالب علم تھے۔ کالج کے لڑکوں نے مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیے ایک ورائٹی شو کیا تھا۔ یوں تو فواد گھر سے کالج تک روزانہ اپنی سائیکل پر ہی آیا جایا کرتے تھے کیونکہ گھر سے کالج تک کا فاصلہ ڈھائی تین میل ہی تھا لیکن اس روز چونکہ پروگرام آرگنائز کرنا تھا اس لیے ان کا ایک ہم جماعت لڑکا اپنی کار میں انہیں لے گیا تھا۔ گو کل تین ساڑھے تین گھنٹے کا پروگرام تھا یعنی دوپہر تین بجے سے شام کے ساڑھے چھ بجے تک کا لیکن چونکہ اس روز صبح سے بارش ہو رہی تھی اس لیے بہت سے تماشائی اور پروگرام پیش کرنے والے مقررہ وقت سے بہت بعد میں آئے تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے ساڑھے چھ کے بجائے یہ پروگرام رات کے ساڑھے آٹھ بجے کہیں جا کر ختم ہوا تھا۔ جس ہم جماعت کے ساتھ گئے تھے اس کے جانے میں کچھ دیر تھی اور ادھر فواد پر بڑے بھائی کی خفگی کا خوف سوار تھا لہٰذا انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ راستے میں کوئی سواری پکڑ کر گھر پہنچ جائیں گے۔

ہلکی ہلکی بارش تو صبح سے ہو رہی تھی۔ فواد کالج کی



عمارت سے باہر نکلے تو ایک دم ہی اس میں تیزی آگئی۔ فواد کو بھاگ کر کالج سے متصل ایک گھر کے برآمدے میں پناہ لینا پڑی۔ اصل میں تو یہ جگہ ان کے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کے آگے جست کا سائبان ڈال کر برآمدہ بنایا گیا تھا اور اسی چھوٹے سے گھر کے بائیں پہلو سے لگی سائیکلوں وغیرہ کی مرمت کرنے والے کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی جہاں سے وہ اکثر و بیشتر اپنی سائیکل کی مرمت کرایا کرتے تھے۔

وہ مکان جس کے چھوٹے سے برآمدے میں وہ کھڑے تھے اس کا ایک ہی بڑا سا دروازہ تھا جو ہمیشہ مقفل ہی نظر آتا تھا مگر گزشتہ چند روز سے وہ دیکھ رہے تھے کہ اب اس دروازے پر سرکنڈوں کی نئی چق ڈال دی گئی ہے۔ گویا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ مکان اب غیر آباد نہیں رہا ہے اور وہ تو اتفاقاً ہی یعنی محض بارش سے بچنے کے لیے وہاں جا کر کھڑے ہوئے تھے کوئی دانستہ تو نہیں کھڑے تھے اور احتیاطاً برآمدے کے سرے پر ہی کھڑے موسلا دھار بارش کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ معلوم یہ بارش کب تھمے اور کتنی دیر میں کوئی سواری ملے اور کب گھر پہنچنا نصیب ہو لیکن اگر سواری ملی ہی نہیں تو پھر کیا اس کیچڑ پانی میں پیدل ہی جانا پڑے گا اور پیدل چلنے کے خیال سے ہی ان کو جھرجھری آگئی۔

"سنیے"

پہلے تو وہ یہی سمجھے کہ ان کے کان بجے ہیں یا پھر ان کا کوئی وہم ہے اس لیے بڑھتے ہوئے قدم جو یہ آواز سن کر پل بھر کے لیے ٹھٹکے تھے پھر آگے بڑھنے لگے۔

"سنیں جناب ملک فواد صاحب۔" آواز اب پہلے کی نسبت ذرا بلند تھی اور پھر اچنبھے کی بات یہ کہ انہیں نام لے کر پکارا گیا۔

سخت تعجب کے عالم میں وہ کھنچے کھنچے چق کے نزدیک آ گئے۔

"کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟" انہوں نے پھر بھی اپنا اطمینان کر لینے کی غرض سے پوچھا۔

"جی میں اس وقت سخت خطرے میں ہوں اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" جواب میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"ہائیں مدد۔ بھلا میں کسی کی کیا مدد کر سکتا ہوں میں تو ابھی اس قابل بھی نہیں۔" مدد کے سوال پر انہوں نے سٹ پٹا کر دل میں سوچا۔ پھر مری مری سی آواز میں بولے۔

"فرمایئے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"میری عزت کو یہاں سخت خطرہ لاحق ہے۔ آپ صرف مجھ پر اتنا کرم کریں کہ یہاں سے باہر نکلنے میں میری مدد کریں۔"

اف ایک تو اجنبی مقام اس پر کسی اجنبی خاتون کا پکارنا اور اس پر مستزاد مدد کی درخواست وہ بھی بھلا کس طور پر کہ اسے اس گھر سے جہاں وہ کھڑی تھی نکال کر کہیں اور پہنچانا۔ کچھ دیر کے لیے تو ان کی ایسی سٹی گم ہوئی کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔

"دیکھیں، آپ کو خدا اور رسول پاک کا واسطہ۔ کسی طور پر میری مدد کیجئے۔ میری جان کو خطرہ لاحق ہوتا تو میں آپ کو مدد کے لیے کبھی نہ کہتی لیکن میری تو عزت خطرے میں ہے جو مجھے اپنی جان سے کہیں پیاری ہے۔ للہ ملک صاحب آپ مجھے یہاں سے کہیں لے چلیے۔" ابھی وہ اپنے سر پر گرتے حیرتوں کے پہاڑوں کا بوجھ سہارنے کی ہی فکر میں لگے زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی سی پوزیشن میں کھڑے تھے کہ ادھر سے حواس کو مختل کر دینے والا مزید ایک مطالبہ ہوا وہ بھی التجا اور عاجزی میں لپٹا لہٰذا ان کی تعجب اور تجسس سے سلب ہوئی گویائی جو تھوڑا بہت کچھ کہنے کو آمادہ ہوئی تھی۔ بالکل ہی مفلوج ہو کر رہ گئی۔

"دیکھیں خدارا یوں سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع نہ کیجئے، وہ مجھے ایک دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے تب ہی تو آج یوں کھلا چھوڑ گیا ہے۔ وہ عورت بھی سو رہی ہے جسے وہ میری نگرانی کے لیے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ خدا کے واسطے جلدی کیجئے۔"

وہ عجلت اور گھبراہٹ میں چق کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ برآمدے میں کوئی بلب

نہیں لگا ہوا تھا لیکن وہ علاقہ کافی روشن تھا۔ سڑکوں پر ایستادہ کھمبوں کی روشنیاں ابھی بارش سے متاثر نہیں ہوئی تھیں اور پھر برابر والے مکان کے برآمدے میں ہی جلتی ہوئی برقی روشنی وہاں تک آرہی تھی۔ جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔ گو نیم تاریکی تھی مگر اس کے باوجود بھی فواد اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ سرتاپا سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بھی بھنوؤں سے لے کر آدھی ٹھوڑی تک۔ مگر یہ ادھ کھلا چہرہ بھی اپنے حسن جہاں سوز کے ایسے ایسے جلوے دکھا رہا تھا کہ فواد کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اور معمول اور قاعدے سے چلنے والی دھڑکنیں اتھل پتھل سی۔ فواد کی عمران دنوں چوبیس پچیس سال کی تھی۔ یعنی چڑھتی اور شہ زور جوانی کا زمانہ تھا۔

لیکن وہ اپنی بعض محرومیوں اور حالات کی وجہ سے اس منہ زور اور سرکش سے دور میں بھی ساکن جھیلوں کی مانند ٹھنڈی اور ٹھہری ٹھہری طبیعت کے حامل تھے۔ بڑے بھائی کا ڈنڈا ہی کچھ ایسا تھا سر پر کہ انہیں معمول سے ہٹ کر کچھ سوچنے کا بھی ہواؤ نہیں پڑتا تھا جب کہ ان کے ہم عمر اور ہم مکتب ہریات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کالج کی ہر ایکٹیوٹی میں پیش پیش نظر آتے تھے۔

جام و مینا، حسن و رعنائی اور عشق و محبت کے قصے کہتے تھے۔ مگر وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی چنے رہتے تھے۔

وہ ترقی پسند ضرور تھے لیکن اپنی اس پسندیدگی کو اپنے اصولوں اور رواجوں پر فوقیت نہیں دیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کے ہم جماعت اور ہم مکتب انہیں تکو نہیں بناتے تھے۔ اور انہوں نے تو اب تک کسی لڑکی کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہ تھا۔

بلکہ کبھی خیال ہی نہ آیا تھا نہ مہلت ہی ملی تھی کچھ سوچنے کی۔ ان پر تو صرف اور صرف اپنی تعلیم مکمل کر لینے کی دھن سوار تھی۔ مگر اب اچانک ہی۔ بڑے حادثاتی طور پر ایک حسین و جمیل لڑکی ان سے ٹکرائی بھی تھی تو مدد کی خواہاں بن کر۔

اور جن حالات میں ٹکرائی تھی۔ ان سے وہ تھوڑا تھوڑا خوف سا محسوس کر رہے تھے۔

کیونکہ دھوکہ دہی، مکر و فریب اور جعل سازی تو ہر زمانے کے ساتھ ساتھ ہی چلتے آرہے ہیں۔ وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ کسی قسم کی چال تو نہیں ہے۔ اس اجنبی خاتون کو میرا نام بھی معلوم ہے۔ کیا یہ میرے خلاف پہلے سے کوئی سازش تو نہیں کی گئی۔ اف اگر اس اجنبی لڑکی نے مجھے کسی الٹے سیدھے چکر میں پھنسا دیا تو بھائی جان تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کچھ ایسے ہی خدشات میں گھرے گم صم سے کھڑے تھے کہ اس نے پھر بہت گڑگڑا کر کہا۔

”دیکھیں مجھے غلط نہ سمجھیں، میں دھوکے باز نہیں ہوں بلکہ مصیبت زدہ ہوں اور میں آپ کے سر بھی پڑنا نہیں چاہتی بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں میں ان درندہ صفت لوگوں سے محفوظ رہ سکوں جو لڑکیوں کو مفت کا مال سمجھ کر فروخت کر دیتے ہیں۔“ اس نے ان کے خیالات کو کیونکر پڑھ لیا تھا، انہیں سخت تعجب ہوا۔ انہوں نے بہت غور سے اس خاتون کو دیکھا، چہرے سے اس کی عمر کا کچا پن صاف عیاں تھا اور خوف و ہراس کے سوا کوئی دوسرا تاثر ہویدا نہ تھا۔

تب انہوں نے بھی اپنی مجبوری بیان کر دی۔

”یقین کریں خاتون! میں آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچانے سے بالکل قاصر ہوں کیونکہ یہاں میرا کوئی دوست اور شناسا ایسا نہیں جو آپ کو اپنے گھر میں جگہ دے سکے اور آپ کو اپنے گھر میں بھی نہیں لے جا سکتا کیونکہ میرے بھائی جان بڑے سخت گیر اور غصیل ہیں اور بھاوج صاحبہ پوری جلاد صفت۔ وہ تو مجھے ہی اتنے غیر وقت گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دیں گی تو پھر آپ کا تو کہنا ہی کیا۔“ اور ان کی بات پر لڑکی کا منہ اتر سا گیا۔

”اچھا، اگر آپ کو یہاں کسی دارالامان قسم کے ادارے کا پتا معلوم ہو تو مجھے وہاں ہی پہنچا دیجئے۔ کم از کم وہاں تو مجھے پورا پورا تحفظ ملے گا۔“ وہ لجاجت سے بولی۔

”مجھے افسوس ہے، میں ایسی کسی جگہ کا پتا نہیں جانتا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کوئی ایسا ادارہ بھی قائم ہے۔“ وہ معذرتی لہجے میں بولے۔

”اوہ تو پھر میں کیا کروں... کہاں جاؤں... اچھا آپ مجھ پر اتنا احسان تو کر سکتے ہیں کہ مجھے دریا تک چھوڑ دیں کیونکہ اب تو اس کی لہریں ہی میری حفاظت کا پورا پورا سامان کر سکتی ہیں۔ دیکھیں میں مکر نہیں کر رہی، کوئی چال نہیں چل رہی بلکہ دل کی پوری صداقت سے کہہ رہی ہوں ملک صاحب! خدارا میری اس درخواست کو تو رد نہ کریں۔“ اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

”معاف کیجئے گا۔ میں اس معاملے میں بھی آپ کی مدد کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ ایک تو اس قدر طوفانی موسم ہو رہا ہے اس پر رات کا وقت کسی سواری کے ملنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے پھر بھلا پانچ چھ میل کا فاصلہ آپ کس طرح طے کر سکیں گی۔“ انہوں نے اتنی سادگی سے کہا کہ روتی ہوئی خاتون کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ گویا اگر سواری ملنے کا امکان ہوتا تو یہ مجھے دریا تک ضرور چھوڑ دیتے۔ اف کس قدر بے غرض اور سیدھے انسان ہیں۔ اس نے دل میں سوچا اور ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عین برآمدے کے آگے ایک کار کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور پھر انجن بند ہونے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی تو لڑکی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”اوہ... دیکھیں وہ آگیا ہے اف اب میں کیا کروں۔“ اور انہوں نے دیکھا واقعی کوئی آگیا تھا۔ انہوں نے جواب میں اس سسکتی تڑپتی خاتون سے کچھ نہ کہا اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے برآمدے کی طرف اتر گئے پھر وہ بھاگنے کے سے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑے اسے کالج میں لے آئے۔ اس سے قدرت کو شاید ان کی نیک نیتی اور ایک مصیبت زدہ کی مدد کرنا بھا گیا تھا۔ کالج کے احاطے ہی میں ایک خالی تانگا کینٹین کے پچھلے کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ تانگے والا بھی بارش سے بچنے کی غرض سے شیڈ کے نیچے ہی دبکا بیٹھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی سواری ہی نے اسے کرائے پر لے رکھا تھا اور وہ سواری کی واپسی کے انتظار میں وہاں کھڑا نظر آرہا تھا۔ پھر بھی فواد نے بڑھ کر اس سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا تانگہ خالی ہے؟“

”نہیں جی۔“ اونگھتے ہوئے تانگے والے نے سخت اکھڑپنے سے جواب دیا اور تب اس کی خوشامد درامد کر کے اور اس خاتون کی ناسازی طبع کا بہانہ کر کے کسی طرح اسے چلنے پر راضی کر ہی لیا۔

”اچھا جی نزدیک ہی رہتے ہو اس لیے لے چلتا ہوں مگر کرایہ پانچ روپے ہو گا۔“

”ہاں ہاں پانچ روپے ہی لے لینا مگر کسی طرح ہمیں ہمارے گھر تک پہنچا دو۔“ فواد نے جلدی سے اس خاتون کے ساتھ تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تو کیا آپ دریا پر نہیں چل رہے۔“ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس خاتون نے پوچھا۔

”نہیں دریا تک جانے پر یہ کبھی راضی نہ ہوتا۔“ فواد نے کہا۔

”تو پھر کہاں جا رہے ہیں؟“ خاتون کے لہجے میں تشویش تھی۔

”میری خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کہاں جاؤں۔ فی الحال تو اپنے محلے کا پتا ہی دے دیا ہے۔“ وہ متفکر سے انداز میں بولے۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کسی ہوٹل میں مجھے لے چلیں اور وہاں ایک کمرہ کرائے پر لے لیں۔“ خاتون نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں! میری اتنی استطاعت نہیں ہے کہ میں ہوٹل کا کوئی کمرہ کرایہ پر لے سکوں۔“ وہ خشک سے لہجے میں بولے۔

”آپ پیسے کی فکر نہ کریں۔ میرے پاس خاصی معقول رقم موجود ہے اور تھوڑا سا زیور بھی۔“ خاتون نے بتایا۔

”یہ ساری چیزیں آپ اپنے پاس ہی رہنے دیں۔ میں نے ایک انتہائی سنگین قدم اٹھایا ہے تو پھر اس سے پیدا شدہ نتائج سے بھی میں خود ہی بھگت لوں گا۔“ انہوں نے کچھ عجیب اکھڑے لہجے میں کہا تو وہ خاتون پھر کچھ نہیں بولی۔ بارش کا زور تھوڑا سا ٹوٹ گیا تھا یعنی

...دھواں اور طوفانی سی کیفیت کچھ کم ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود بھی چھاجوں پانی پڑ رہا تھا اتنی دیر میں سڑکیں بھی دریا بن گئی تھیں، مگر تانگے والا بڑی مہارت اور چابک دستی سے تانگہ دوڑا رہا تھا۔ وہ دونوں تانگے والے سمیت بھیگ کر چوڑا ہوگئے تھے۔ بالآخر خدا خدا کرکے وہ محلہ بھی آگیا جس کا انہوں نے تانگے والے کو پتا بتایا تھا۔ پھر ایک پرانی طرز کے کوٹھی نما مکان کے آگے انہوں نے تانگہ رکوایا۔ تانگے والے کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ تھمایا اور پھر اس اجنبی خاتون کو ساتھ لے کر مکان کا رخ کیا۔

"کیا، کیا یہ آپ کا مکان ہے۔" خاتون نے بڑی سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں بس سر چھپانے کے لیے فی لوقت ایک عارضی ٹھکانا ہے۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کے بھائی اور بھاوج۔" خاتون نے ہراساں ہو کر کہنا چاہا۔

"ہاں وہ دونوں بہت سخت بلکہ جابرانہ فطرتوں کے مالک ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں، یہ قدرت ہی کی کوئی مصلحت ہوگی کہ اس نے بیٹھے بٹھائے ناگہانی طور پر مجھے ایک خاتون کی عزت بچانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ تو اب وہی اس بات کے نبھ جانے کی بھی صورت پیدا کرے گی۔" انہوں نے اس کی بات قطع کرکے کہا اور پھر بولے۔

"لیکن یہ ضرور ذہن نشین کرلیجے کہ آپ اپنے بارے میں یہاں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے خواہ کوئی محبت سے پوچھے یا جبر سے اور رو میں رلائیں گی بھی نہیں۔" وہ بات تو سمجھانے کے سے انداز میں کر رہے تھے مگر ان کے لہجے میں تحکم بھی تھا اور تنبیہہ بھی۔

"لیکن ___ لیکن آپ بلاوجہ میری ذمہ داری سر کیوں مول لے رہے ہیں۔ میرا منشا بخدا یہ نہیں تھا اور نہ ہے کہ میں کلیتاً اپنا سارا بوجھ آپ کے کاندھوں پر ڈال دوں یا آپ کے سگوں سے آپ کو بدظن کردوں آپ اس وقت بھی چاہیں تو مجھے کسی ہوٹل کا کمرہ دلوا سکتے ہیں۔"

"نہیں ہوٹل میں آپ کی حفاظت کی میں ضمانت نہیں دے سکتا آپ آئیں تو سہی اب تو میں نے اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے اب میں خدا کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوں۔" اب کی بار ان کا لہجہ نہایت نرم اور یگانگت بھرا تھا۔ مرد اگر تنکے کا بھی سہارا دے تو ایک بے کس اور بے بس عورت خود کو دنیا کے مضبوط اور محفوظ ترین حصار میں جکڑا ہوا سمجھتی ہے اور یہ مرد تو اپنے ادھورے پن اور اپنے بڑے بھائی کے غیض و غضب کی پروا کیے بغیر عارضی طور پر ہی سہی اس حالات سے بے بس اور بد دل ہو جانے والی لڑکی کو جو موت کو گلے لگانے سے بھی دریغ نہیں کر رہی تھی اتنا بڑا سہارا دے رہا تھا۔ اس نے بھی محض فواد کے ایما اور بھروسے پر اگلی ہی ساعتوں میں پیش آنے والی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنا دل مضبوط کرلیا تھا۔

فواد اسے ساتھ لیے اندر داخل ہوئے تو انہیں اپنے بھائی بہت مضطربانہ انداز میں برآمدے میں ٹہلتے نظر آئے اور ان کے کڑے تیور دیکھ کر فواد کا دل یکبارگی اس بری طرح کانپا کہ ان کے بڑھتے ہوئے قدم جم کر رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے بڑی سختی سے اپنی اس کمزوری پر خود کو جھڑکا اور دل مضبوط کرکے اجنبی خاتون کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ ملک جواد کی قہر آلود نظریں ان پر پڑیں تو ان کے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے جم کر رہ گئیں پھر انہوں نے بڑی کراری اور پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

"تو کہاں تھا اب تک اور یہ کس کو اپنے ساتھ لگا کر لایا ہے؟۔" اور فواد جواب میں کیا کہتے جب کہ خود ان کو بھی علم نہ تھا کہ یہ اجنبی لڑکی کون ہے اور کیا ہے۔ انہوں نے ہراساں ہو کر ایک نظر ساتھ کھڑی لڑکی پر ڈالی جس کا آدھا کھلا چہرہ خوف سے زرد سا پڑ گیا تھا اور چہرہ جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

"ابے فالج کیوں گر گیا منہ پر؟ بتاتا کیوں نہیں کہ اس حرافہ کو کہیں سے بھگا کر لایا ہے یا اغوا کرکے۔" ملک جواد نے پھر گلا پھاڑ کر پوچھا اور ان کے ان رکیک الزامات پر فواد کا خوب صورت چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔



"آ ___ آپ سوچ سمجھ کر بولیے بھائی جان۔ میں انہیں بھگا کر لایا ہوں نہ اغوا کرکے بلکہ یہ میری منکوحہ ہیں یعنی قانونی طور پر میری بیوی۔" فواد نے زندگی میں پہلی بار بھائی کے سامنے اس قدر دلیری سے اور تن کر بات کی تھی۔ ان کی بھابھی ناصرہ جو میاں کی دھاڑ سن کر پانی پیتے پیتے کٹورا ہاتھ میں لیے برآمدے میں چلی آئی تھیں، فواد کی بات پر مارے حیرت کے کٹورا ان کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ غصے سے بلبلا ہی اٹھیں۔

"اوہو جب ہی تو میں کہوں کہ یہ روز روز تیار ہو کر پہروں گھر سے کہاں غائب رہتا ہے۔ تو یہ گلچھرے اڑا رہے تھے میاں صاحب۔ ہونہہ بڑی منکوحہ ہے، بیوی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تیری سیاہ کاریوں نے اسے تیرے سر چپک دیا ہے جو یہ لگی لگی ساتھ چلی آئی ہے۔"

"اوہو پھر آگئیں تم ٹیکے کی طرح بیچ میں بولنے۔ یہ اس کی منکوحہ ہے یا آشنا، یہ تو میں ابھی چٹکی بجاتے ہی معلوم کرلوں گا۔ پہلے ذرا مجھے اس سے بات تو کرلینے دو۔"

"اے اب کیا بات کریں گے آپ۔ اس نے تو پورے جگت بھر میں آپ کی ناک کٹوا کر رکھ دی۔ بھلا اس کی جرات تو دیکھو کہ اس فاحشہ کو یہاں بھی لے آیا، جانے کون ہے۔ کیا ہے اور جانے چکلے پر سے اٹھا کر لایا ہے یا کوڑی پر سے، کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں غلاظت کے کیڑوں کو جلدی سے دفعان کیجیے یہاں سے۔" ناصرہ بیگم شروع ہوگئی تھیں تو اب ان کو خاموش کرانا مشکل ہی تھا۔

"تم چپکی نہیں رہو گی ناصرہ۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے دھاڑے۔

"اے لو بجائے اس کے کہ ڈنڈا لے کر موئے اس نابکار پر پل پڑیں الٹا مجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔" میاں کے ڈانٹنے پر بھی ناصرہ بیگم بولے بغیر نہ رہیں مگر پھر اس کے بعد چپ ہوگئیں۔ بیوی کی باتوں سے ملک جواد مشتعل سے ہوگئے تھے۔ انہوں نے بڑے غضب ناک لہجے میں فواد سے پوچھا۔

"ہاں تو بتا تو کیا ثبوت پیش کر سکتا ہے کہ یہ تیری منکوحہ ہی ہے۔" اس سوال پر گھڑی بھر کو تو فواد کی سٹی ہی گم ہوگئی مگر پھر انہوں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

"سب سے پہلا ثبوت تو یہی ہے کہ فواد اپنے بڑے بھائی جان کے سامنے کبھی کوئی جھوٹ یا غلط بات نہیں کہہ سکتا اور دوسرا وہ نکاح نامہ لیکن وہ جلدی میں ان کے گھر ہی رہ گیا ہے۔ وہ میں کل کسی وقت آپ کو لا کر دکھا دوں گا۔"

"ہونہہ سب بھٹ ماری کی باتیں ہیں کہ خود آگئے اور نکاح نامہ بھول آئے جب کہ یہ بھی معلوم تھا کہ اسے دیکھ کر بھی ہم تمہاری یہ بات تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتے۔" ناصرہ بیگم سے پھر بولے بغیر نہ رہا گیا۔

"لاحول ولا قوۃ پتا نہیں کس مٹی کی بنی عورت ہو۔" جواد صاحب نے پھر اپنی بیوی کو جھڑکا اور پھر فواد سے بولے۔

"مگر یہ تجھ پر چوروں اور مجرموں کی طرح چپکے سے نکاح کرکے بیٹھ جانے کی کیا مصیبت آئی تھی کیا مار پڑ گئی تھی تجھ پر اتنی جلد شادی رچا لینے کی۔ ابھی تو تو نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی پھر اس کو کیا بھیک مانگ مانگ کر کھلائے گا اور تیرے خیال میں، میں مر گیا تھا یا تو مجھے اپنا بڑا بھائی نہیں سمجھتا تھا جو تو نے مجھ سے ذکر کیا نہ اجازت لی۔" جواد صاحب کہہ تو بڑے غصے میں رہے تھے لیکن اب وہ تیزی اور لپک کم ہوگئی تھی ان کے لہجے میں۔

"نہیں ___ نہیں۔ آپ کو ابا جی کی جگہ نہ سمجھتا تو پھر انہیں آپ کی خدمت میں کیوں لاتا، البتہ مجھ سے بڑی تقصیر ہوگئی کہ آپ سے اجازت نہ لے سکا۔ اصل میں تو یہ سب نہایت اتفاقی طور پر اور عجلت میں۔"

"اے بس بس رہنے بھی دے یہ بہانے بازیاں۔ تو تو ہے ہی ہمیشہ کا گھنا، موا، نمک حرام تیری تو وہی خاصیت ہے کہ جس ہنڈیا میں کھائے اسی میں چھید کرے۔ بڑا بے چارہ مسکین صورت بنائے کھڑا ہے تو بڑے بھائی کو گردانتا ہی کہاں ہے بدبخت! جا اپنا یہ غلاظت کا ڈھیر اپنے ساتھ ہی اٹھا کر لے جا اور کسی اور

جگہ جا کر اس کے ساتھ اپنا منہ کالا کر۔" ناصرہ بیگم اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔ وہ بولے بنا رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔ مگر ان کی اس قدر اخلاق سے گری ہوئی گفتگو نے فواد کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ دانت بھینچ کر چلائے۔

"بھابھی جان آپ کے لیے بہتر یہی ہے آپ خاموش رہیں۔ میں اپنے بھائی جان سے بات کر رہا ہوں اور ہر بات کا فیصلہ ان پر چھوڑتا ہوں۔ جو کچھ یہ کہیں گے میں اس کی تعمیل میں سر جھکا دوں گا۔ یہ اگر ٹھوکریں مار کر مجھے گھر سے باہر بھی نکال دیں گے تو میں چپ چاپ نکل جاؤں گا لیکن ان کے سوا میں کسی کی کوئی بات سنوں گا نہ مانوں گا۔" جواد صاحب کو اس کی باتوں پر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا بھائی کس فطرت اور مزاج کا حامل ہے اور کس قدر ان کی عزت اور احترام کرتا ہے اس کے باوجود بھی انہوں نے بیوی کی بات ہیٹی کرنی مناسب نہیں سمجھی اور بڑے نفرت بھرے انداز میں بولے۔

"میرا فیصلہ بھی یہی ہے کہ تو یہاں سے ابھی اور اسی وقت اپنی یہ گناہوں کی کالک تھپی' پھٹکار ماری صورت لے کر نکل جا اور تو یہاں آیا ہی کیوں؟۔ تجھے کس نے مشورہ دیا تھا اس چھوکری کو ساتھ لے کر آنے کا۔"

"یہ آپ کے زیر سایہ رہنے اور آپ کی خدمت کرنے کی بڑی خواہش مند تھیں۔ یہی ضد کر کے یہاں آئی ہیں۔" فواد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"اے بس بس رہنے دے یہ پھوہڑ دلالے ـــــ یہ نجس بیسوا یہاں میرے گھر میں کبھی نہیں رہ سکتی۔ لے جا اسے وہیں جہاں سے لایا ہے اور خبردار جو آئندہ تو نے کبھی اس گھر میں قدم رکھا۔" بھائی کے کچھ کہنے سے پہلے بھاوج پھپھک کر بولیں۔ ان کی بات پر لڑکی نے تڑپ کر کچھ کہنا چاہا لیکن فواد نے اسے کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا۔ جلدی سے خود ہی بولے۔

"تو کیا یہ آپ کا بھی حکم ہے بھائی جان۔"

"ہاں فوراً" نکل جاؤ یہاں سے اس بچی کو لے کر۔" جواد صاحب نے بھی تڑخ کر کہا۔

"بہتر ہے بھائی جان! مگر چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے اتنی اجازت اور دے دیجیے کہ میں آج رات یہاں گزار لوں کیونکہ اس طوفانی موسم میں اس وقت کسی سواری کا ملنا ممکن ہی نہیں۔" فواد نے بھائی کے غصے کی پروا کیے بغیر درخواست سی کی۔

"اے جا مر یہاں سے مردود میرا بچوں کا ساتھ ہے' تجھ جیسے نجس انسان کی ایک منٹ کی بھی روادار نہیں۔" جواد صاحب کے بجائے ناصرہ بیگم نے پھر کہا۔

"نہیں نہیں' آپ انہیں گھر سے نہیں نکالیے میں ابھی ابھی خود ہی چلی جاتی ہوں۔" لڑکی کو آخر ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

"نہیں' آپ کہیں نہیں جائیں گی کیونکہ اب آپ میری ہی نہیں اس گھر کی بھی عزت ہیں۔" فواد قدرے فہمائشی انداز میں بولے اور پھر بھائی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"ہاں تو پھر بھائی جان! کیا مجھے یہاں ایک رات بسر کرنے کی اجازت مل سکے گی۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ رات کو اگر یہاں رکنا ہی چاہتے ہو تو پھر یہ بھی سن لو کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے دفعان ہو جانا کیونکہ یہاں محلے میں ہماری بڑی عزت ہے جسے ہم تم جیسے ننگ خاندان کی طرح خاک میں ملانا نہیں چاہتے۔"

"بہتر ہے بھائی جان میں پو پھٹنے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔" فواد نے بڑی تابعداری سے کہا اور پھر اس ڈر سے کہ بھاوج مزید کوئی روڑا نہ اٹکائیں۔ وہ لڑکی کو ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دیے لیکن ناصرہ بیگم میاں کی اس رعایت کو آسانی سے قبول کر لیتیں وہ فوراً" ہی شروع ہو گئیں۔

"اے لو اتنے مزے سے اجازت بھی دے دی۔ یہ بھی بھلا کسی رعایت کا مستحق تھا۔ بد معاش ـــ کہیں کا ـــ چپکے سے نکاح بھی کر بیٹھا۔ اب کون جانے کہ



حقیقت کیا ہے اگر چھپایا ہی تھا تو پھر کونے کھدرے میں چھپا کر رکھتا۔ اسے اتنے طوفانی موسم میں یہاں لے کر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی یقیناً" کوئی چکر ہی ہو گا۔ آپ نے یہ تو پوچھا ہوتا کہ ایسی کیا آفت آن پڑی تھی تجھ پر یوں چپکے سے شادی رچانے کی اور کب رچائی' کس وقت رچائی' کہاں رچائی مگر آپ تو الٹے اس کی لچھے دار باتوں میں آ گئے۔ لو بھلا اب میں آپا جان کو کیا جواب دوں گی جو عرصے سے آس لگائی بیٹھی ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ محض زبیدہ سے جان چھڑانے کو اس نے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔"

"اُفوہ! اب بس بھی کرو۔ تمہاری زبان تو طوفان میل سے بھی زیادہ رفتار میں چلتی ہے۔ (ارے عقل کی پوری میں نے اسی لیے تو اسے گھر سے نکال دیا ہے کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری تو پھر اس سے کچھ کہنا یا پوچھنا بیکار ہی ہوتا نا۔" جواد صاحب اپنی بیوی کے تان اسٹاپ طریقے سے بولنے پر اکتا کر بولے۔ اور پھر اپنے کمرے میں چل دیے۔

وہ اسے اپنے کمرے میں لے کر آئے تو کمرہ کسی فساد زدہ علاقے کا نقشہ پیش کرتا نظر آیا۔ اول تو یہ کمرہ کیا ایک کوٹھڑی سی تھی جو کسی کباڑ خانے سے کم نہ تھی۔ جس کے ایک کونے میں گھر کے پرانے اور زنگ آلود کنستر نما ٹین ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور دوسری طرف برسوں کی جمع شدہ اخبارات کاپیوں اور کتابوں کی ردی۔ ایک کونے میں ایک پرانا گھن لگا ہوا شوریک رکھا ہوا تھا جس کے خانوں میں شیشیاں' کپڑے' جوتے سب ہی بھرے تھے اور جس کے بالائی حصے پر جگہ جگہ سے روغن اکھڑا ہوا ایک چھوٹا سا آئینہ رکھا تھا اور شیو کا ٹوٹا پھوٹا سامان۔ ایک کونے میں صراحی' لوٹا' بالٹی' صابن دانی وغیرہ رکھی تھی اور چوتھے کونے میں جست کے نلکوں کا جھلنگا پڑا تھا جس پر بچھی بد رنگ اور بد نما دری پر میلی چیکٹ سی چادر پڑی تھی اور ایک تکیہ جس کا غلاف میل اور چکنائی کی وجہ سے موم جامہ بن چکا تھا۔ پلنگ کے ارد گرد اور نیچے تک میلے کپڑے' جرابیں' جوتے بکھرے پڑے تھے اور پلنگ کے سرہانے پایہ ٹوٹی تپائی پر جس کے نیچے اینٹ لگی تھی' کتابوں اور کاپیوں کا ایک ٹیلہ سا بنا ہوا تھا۔ کمرے کی اس بدحالی اور زبوں حالی پر فواد خفیف سے ہو کر بولے۔

"دراصل میرا یہ کمرہ تو برائے نام ہی ہے ورنہ صحیح معنوں میں یہ اسٹور روم بھی نہیں بلکہ کباڑ خانہ ہے اس پر بچے بھی اسے کھیل کا میدان تصور کرتے ہیں۔ بہر حال ایک رات ہی کا تو معاملہ ہے۔" جواب میں وہ خاموش ہی رہی اور کمرے کی بے ترتیبی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتی ہوئی ریک کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"اگر آپ مجھے کسی ہوٹل میں کمرہ دلوا دیتے تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔" وہ ریک کے آگے کھڑے کھڑے بولی۔

"کیسی نوبت؟" انہوں نے اپنے پلنگ اور فرش پر بکھری چیزیں جلد جلد سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہی ابھی ابھی جو آپ کو میری وجہ سے اتنا کچھ سننا پڑا۔" اس نے کہا۔

"ارے نہیں' میں تو ان باتوں کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ اب مجھ پر کوئی بڑی سے بڑی بات بھی اثر نہیں کرتی۔" انہوں نے میلے چیکٹ تکیے پر جلدی سے اپنا تولیہ پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر اپنا گیلا جوڑا واحد کوٹ اتار اسے کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے انہیں کچھ خیال آیا تو وہ سر کو ہلکے سے جھٹک کر بولے۔

"لیکن آج تو مجھے خود اپنے اوپر تعجب ہو رہا ہے کہ میں نے بھائی جان کے سامنے اس قدر ڈٹ کر اور اتنی دیدہ دلیری سے اتنی ساری باتیں کیسے کر ڈالیں اور وہ بھی سخت غلط بیانی پر محمول جب کہ میں معمولی معمولی باتوں پر مار کھاتا تھا' بڑی سزائیں بھگتتا تھا لیکن کبھی منہ سے اف تک نہ کرتا تھا۔ اصل میں بھائی جان کا مجھ پر رعب ہی ایسا تھا اور بھائی جان سے تو میرے روح فنا ہوتی تھی مگر آج تو میں بالکل نہیں ڈرا۔"

"اصل میں انسان جب تک ڈرتا رہتا ہے معمولی سے معمولی کام کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کر لے تو بڑے سے بڑا کام کر گزرتا ہے۔" وہ بدستور شوریک کی طرف منہ کیے بولی۔

"ہاں علیٰ ہذالقیاس۔ یعنی آج کے تجربے سے تو آپ کی بات سو فیصد درست ہی ثابت ہوتی ہے لیکن میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں کہ میرے اپنوں نے آپ سے بہت ناروا سلوک کیا ہے۔"

"لیکن میرے خیال میں تو آپ کے اپنوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک ہی کیا ہے۔ کیونکہ بات ہی ایسی غیر معقول اور ناقابل قبول تھی۔" لڑکی نے جواب میں کہا۔

"بہر کیف اس انوکھے تجربے نے مجھے آج اتنا ضرور بتا دیا کہ میرے اپنے کتنے پانی میں ہیں۔" وہ تاسف بھرے انداز میں بولے۔

"آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اس کا بدلہ۔۔۔"

"کون سے احسان کا ذکر کر رہی ہیں آپ۔" لڑکی کی بات قطع کر کے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر انہوں نے پوچھا۔

"یہی جو آپ نے بالکل غیر اور اجنبی ہوتے ہوئے مجھ پر کیا ہے۔"

"لیکن میں نے احسان تو نہیں ایک انسانی فریضہ ادا کیا ہے آپ نے مجھ سے مدد مانگی تھی' اپنی عزت کا تحفظ مانگا تھا' سو میں نے دے دیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں لا کر خوار بھی کرایا۔" اپنی بات کہتے کہتے ان کے دل میں اسے ڈھنگ سے دیکھنے کی خواہش جاگی جسے انہوں نے سختی سے دل ہی میں دبا لیا۔

"ذلت' خواری اور دربدر کی ٹھوکریں تو اب میرا مقدر بن چکی ہیں فواد صاحب! مگر مجھے رنج اور شرمندگی ہے تو اس بات پر کہ میری وجہ سے آپ بھی مشکل میں پھنس گئے اب جہاں تک مجھے یقین ہے یہ لوگ آپ کو اس گھر میں نہیں رہنے دیں گے۔" لڑکی قدرے تردد کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

"ارے چھوڑیں' یہاں کسے پروا ہے۔ ہم تو درویش صفت آدمی ہیں جہاں چھاؤں گھنی دیکھیں گے وہیں دھونی مار کر بیٹھ جائیں گے۔ کھانے دانے کی پرواہ بھی اس لیے نہیں کرتے کہ یہاں کھانا بھی ہمیشہ آدھا پیٹ ہی ملتا ہے ویسے یہ میرا بی اے کا آخری سال ہے۔ بہرحال دو ٹیوشنیں تو لگی ہوئی ہیں۔ دو چار اور ڈھونڈ لوں گا۔" وہ بات کو لاپروائی میں اڑا کر بولے۔

"اچھا اب آپ آرام کریں۔ یہ میرا پلنگ حاضر ہے۔۔۔ اطمینان سے اس پر لیٹ جائیں۔ چند گھنٹوں کی تو بات ہے وہ میں اوپر چھت پر گزار لوں گا۔"

"چھت پر۔" وہ جو اتنی دیر سے خود کو ان کی نظروں سے چھپانا چاہ رہی تھی ایک دم ہی ان کی طرف گھوم کر بولی۔

"لیکن باہر تو اب بھی بارش ہو رہی ہے پھر آپ چھت پر کیسے سو سکیں گے۔" اس نے تردد سے پوچھا۔ گھبراہٹ میں ماتھا اور ٹھوڑی کا نچلا حصہ کھل چکا تھا۔ وہ مبہوت سے اس پیکر حسن و جمال کو دیکھتے رہ گئے تو فوراً" ہی لڑکی کو اپنی بے پردگی کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے پھر گھوم گئی۔

"آپ۔۔۔ آپ یہیں آرام سے اپنے پلنگ پر سوئیں۔۔۔ میں آج کل کم ہی سوتی ہوں اور آج تو مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔" اس نے پھر کہا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز مرتعش تھی۔ وہ بھی فوراً" ہی ہوش میں آ گئے تھے۔ اپنی بے ساختگی پر تھوڑا سا جھینپ کر بولے۔

"لیکن چھت پر زینے سے ملحق ایک کباڑ خانہ اور بھی ہے۔ اس کے آگے ٹین کا کافی چوڑا سائبان ہے اور میں اس سائبان کے نیچے ہی سوؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ میں بہت عادی ہوں وہاں سونے کا کیونکہ جب بھابھی جان کو کوئی سخت سزا دینا مقصود ہوتی ہے تو وہ مجھے وہیں سلواتی ہیں۔" آخری فقرہ انہوں نے تھوڑا سا ہنس کر کہا۔ اور پھر کمرے کا دوسرا دروازہ کھول کر باہر جانے لگے تو جاتے جاتے معاً" کچھ خیال آیا۔

"ارے ہاں' آپ نے کچھ کھایا پیا بھی تھا یا صرف ڈر اور خوف ہی پر گزارہ کرتی رہیں۔" انہوں نے پلٹ کر پوچھا۔

"ظاہر ہے ڈر اور خوف اتنی بھاری غذا ہوتی ہے کہ اس کے کھانے کے بعد کسی اور کھانے کو ہاضمہ قبول ہی نہیں کرتا۔" لڑکی نے جواباً" کہا۔ لہجے میں شگفتگی بھی تھی اور برجستگی بھی۔ فواد کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"اور کچھ نہیں لیکن کیا اتنا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو میرا نام کیونکر معلوم ہوا۔" آخر انہوں نے بڑی دیر سے دل میں آتے ہوئے سوال کو زبان دے ہی دی۔ انہوں نے اور کچھ کہہ کر سوال کی ابتدا کی تھی۔ لڑکی بڑی زیرک تھی مسکرا کر بولی۔

"اور کچھ پوچھنے سے حاصل ہی کیا ہو گا۔ البتہ آپ کا نام میں نے اس سائیکل والے کو لیتے بارہا سنا تھا۔"

"نہیں مگر کیسے؟ آپ تو غالباً" اس گھر میں آج ہی آئی تھیں۔" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں' اس گھر میں تو میں تقریباً" ایک ڈیڑھ ماہ سے رہ رہی تھی۔ وہ باہر دروازے میں تالا ڈال جاتا تھا۔ میں اکثر دروازے کی جھری سے باہر کا نظارہ کیا کرتی تھی اور تب ہی ایک دن میں نے آپ کو دیکھا تھا پھر اکثر و بیشتر دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا اور نام سے بھی واقفیت ہو گئی۔ اب یہ تو محض اتفاق ہی تھا یا میری خوش نصیبی کہ آج آپ بارش سے پناہ لینے خود ہی ایک ایسے نازک وقت پر وہاں آ کھڑے ہوئے جب کہ میری جان پر بن رہی تھی۔" لڑکی نے بہت ٹھہر ٹھہر اور جھجک جھجک کر یہ ساری تفصیل بتائی۔

"ہاں جس کی حفاظت کرنی منظور ہوتی ہے۔ قدرت اس کے بچاؤ کی خود ہی کوئی نہ کوئی سبیل نکال دیتی ہے ورنہ یقین جانیں آپ کے منہ سے اپنا نام سن کر میں تو یہی سمجھا تھا کہ کسی آسیب واسیب کا چکر ہے اور ایسی چیزوں سے تو میرا خون خشک ہوتا ہے۔" انہوں نے جس سادگی سے سہمے سہمے انداز میں اپنی بات کہی۔ لڑکی کو ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ اسے ہنستا ہوا نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ ہنوز ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

"اچھا۔ میں چھت پر جا رہا ہوں۔ آپ دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا لیں۔" انہوں نے کہا اور پھر فوراً" ہی باہر نکل گئے۔

وہ چھت پر پہنچے تو کباڑ خانے کی دیوار سے لگی بان کی جھلنگا چارپائی بچھا کر اس پر لیٹ گئے۔ آج سارا دن اتنے مصروف رہے تھے کہ تھکن سے سارا جسم چور چور ہو رہا تھا لیکن کچھ گیلے کپڑوں کی وجہ سے جنہیں لڑکی کی موجودگی میں تبدیل کرنا انہیں مناسب نہیں لگا تھا۔ کچھ جھولا اور نم چارپائی کے کارن اور کچھ آج کی اچانک پڑنے والی افتاد کی وجہ سے نیند ان کی آنکھوں میں گھلنے بھی لگی تو اسے انہوں نے بھگا دیا کیونکہ نیم غنودگی کے عالم میں پل کی پل کو نیند کا کوئی جھونکا آتا بھی تو وہ فوراً" ہی اسے جھٹک دیتے۔

ذہن تو طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور وہ جھونک کھا کھا کر سوچے جا رہے تھے' وہی سب جو آج صرف دو ڈھائی گھنٹوں میں ان پر بیتا تھا۔

انہیں خود پر تعجب نہیں بلکہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان جیسے بودے' بے زبان اور ادھورے سے انسان نے اتنا بڑا اقدام کیسے کر لیا۔

ان میں اتنی ہمت اور حوصلہ کیونکر پیدا ہوا کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کو ایسے طوفانی موسم میں اور اتنی رات گئے گھر لے آئے اور اتنی جرات کیسے ہوئی کہ اسے اپنی منکوحہ ظاہر کر کے بلا خوف و خطر اپنے سخت گیر بلکہ سنگدل بھائی اور ظالم و جابر بھاوج کے سامنے ڈٹ کر بات بھی کر لی اور اب سکون سے حالات پر غور کرنے کا موقع ملا تھا تو وہ سوچ رہے تھے کہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس اجنبی لڑکی پر کون سے افتاد پڑی ہے۔

اور وہ کون ہے کیا ہے؟

کن عادات اور کیسے چال چلن کی مالک ہے۔

حتیٰ کہ انہیں تو اس کا نام تک نہ معلوم تھا۔

کہیں لڑکی نے میرے ساتھ یہ کوئی چال نہ چلی ہو۔ مجھے کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش نہ کی ہو۔

اب یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھے مقفل دروازے کی جھریوں سے جھانک کر دیکھا کرتی تھی۔

اور یوں اسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔

جب کہ وہ مکان تو ایک عرصے سے غیر آباد پڑا تھا۔ اور دن کے وقت ہی نہیں مجھے تو اکثر و بیشتر شام کو بھی اس کے آگے سے گزرنے کا اتفاق ہوتا رہا تھا۔

ہمیشہ مکان کو تاریک اور دروازے کو مقفل ہی دیکھا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا تھا کہ سائیکل کی

مرمت کرانے کے دوران کچھ دیر کے لیے میں برآمدے کی سیڑھی پر بھی جا بیٹھتا تھا۔

زندگی تو بہرحال ایک تحریک کا نام ہے تو پھر مجھے مکان کے اندر سے کسی حرکت کا تو احساس ہوتا۔

اور اب میں نے سب سے بڑی حماقت یہ کی کہ بھائی اور بھابی جان کے سامنے اسے اپنی منکوحہ ظاہر کر کے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ایک مشکل میں پھنسا دیا۔

مگر نہیں نہیں، شکل و صورت سے تو وہ بہت معصوم نظر آتی ہے۔

عمر میں بھی کچھ زیادہ نہیں لگتی۔ یہی انیس بیس برس کی معلوم ہوتی ہے۔

اور گفتگو بھی بہت شائستہ انداز میں کرتی ہے۔

فلسفیانہ اور سمجھ داری کی، خاصی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ کمرے میں آتے ہی مجھ سے اجتناب بھی برتتی رہی اور جب تک میں کمرے میں موجود رہا، وہ رخ پھیرے ہی کھڑی رہی۔

اگر کوئی ایسی ویسی ہوتی تو الٹا مجھے ناز و انداز دکھا کر پرچانے کی کوشش کرتی۔ میں نے اسے منکوحہ کہا تھا تو وہ میری اس یا وہ گوئی کو میری کمزوری سمجھ کر کچھ تو جتانے کی کوشش کرتی یا جب میں نے کہا تھا کہ صرف ایک رات ہی کا تو معاملہ ہے تو وہ کہتی کہ یہ رات ختم ہونے کے بعد میں کہاں جاؤں گی۔ کس گھر میں پناہ لوں گی مگر اس نے اشارتاً "کنایتاً" بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ ایسا کوئی تاثر تک نہیں دیا۔ بلکہ خود میری ذات کو بھی ذرا سی اہمیت نہیں دی۔

بہرحال اس کے تحفظ کی ذمہ داری قدرت نے مجھے سونپی ہے اور اصولاً "تو مجھے اس ذمہ داری کو احسن طریق پر نبھانا چاہیے، لیکن میں اس معاملے میں کس قدر بے بس اور مجبور ہوں کہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ایک کابک نما کمرہ ملا ہوا تھا تو اس کی مدد کرنے کے جرم میں وہ بھی مجھ سے چھن گیا۔ کون جانے کہ اب کہاں بسیرا کرنا پڑے۔ فٹ پاتھ یا کسی دکان کے تھڑے پر یا پھر پرانے کھنڈرات کے کسی ویران گوشے میں۔ اس کی اس بات میں کسی قدر سچائی اور وزن تھا کہ انسان جب تک ڈرتا رہے، ڈھنگ سے ایک معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اگر اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کرے تو بڑے سے بڑے طوفانوں سے ٹکر لے سکتا ہے اور اب میں نے اپنے اندر ہمت تو پیدا کرلی ہے کہ خود اپنا کفیل بن کر رہ سکوں۔ لہٰذا اب میں بھائی اور بھابی کا محکوم بن کر اس گھر میں نہیں رہوں گا جہاں مجھے بچپن سے لے کر اب تک ذلت اور نفرت ہی ملی ہے اور اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو میں اور وہ ایک کشتی کے سوار ہیں۔ وہ بھی اس دنیا میں تہی دست، بے بس اور تنہا ہے۔۔۔ اور میں بھی۔۔۔ بس فرق ہے تو صرف اصناف کا کہ وہ لطیف اور بلور کی طرح نازک شے ہے۔ اپنی موتی کی آب جیسی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتی پر میں بھی کیا کروں۔ میں اس کی وجہ سے اپنے مستقبل اور اپنے آدرش کو تباہ تو نہیں کر سکتا۔

بارش کی شدت میں کمی آ گئی تھی، مگر وہ اب بھی برسے ہی جا رہی تھی۔ وہ نیند کے جھولے میں ہلکورے لیتے یہ سب سوچے جا رہے تھے کبھی کوئی ہوا کا تیز جھونکا پانی کی بوچھاڑ ان کی طرف اچھال دیتا تو نیند ہرن ہو جاتی۔

کہتے ہیں کہ غنودگی بھی نیند کی ایک شکل ہی ہوتی ہے اور خاموش لیٹ کر صرف غنودگی کے عالم میں وقت گزار کر بھی انسان اپنی فطری نیند پوری کر لیتا ہے لیکن وہاں تو دماغ پر ایک بوجھ سا غالب تھا۔ رات کی آخری ساعتوں میں جب بارش کا زور بالکل ہی ٹوٹ گیا تو ان سے لیٹا بھی نہ گیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ایک بے چینی سی ان پر غالب تھی جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور جس نے کچھ دیر بعد انہیں اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ترشح اب بھی بدستور جاری تھا۔ وہ ننھی ننھی بوندوں میں بڑی دیر تک ٹہلتے رہے پھر جوں ہی کسی مرغ کی پہلی بانگ سنائی دی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ کمرے کا دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا جسے کھول کر وہ اندر آئے تو انہوں نے چالیس یونٹ کے بلب کی زرد روشنی میں دیکھا۔ وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

اسے یوں چوروں کی طرح چپکے سے باہر نکلتے دیکھ کر ان کے دل میں بہت سے شکوک رینگنے حالانکہ یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کباڑ خانے نما کمرے میں کوئی ایک بھی کام کی ایسی چیز نہیں ہے جس کے چرا لینے سے کسی کا تھوڑا سا بھی بھلا ہو جائے۔ پھر بھی یہ انسانی فطرت ہوتی ہے کہ وہ بلا سبب ہی بدگمان ہو جاتا ہے۔

"یوں اس طرح چوری چھپے فرار ہونا کوئی معقولیت تو نہیں۔" انہوں نے تیزی سے اس کے نزدیک جا کر کہا۔ لہجے میں بھی خاصی کھنک تھی۔

اور ان کی بات پر وہ تیزی سے ان کی طرف گھومی۔ تعجب سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ نے میرے متعلق بہت غلط اندازہ لگایا۔ بہرحال میں آپ کے سامنے موجود ہوں، آپ بخوشی میری تلاشی لے سکتے ہیں۔ یہ دیکھیے میرے پاس اس پوٹلی کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہی میری کل متاع ہے۔ اس میں میرے چند قیمتی زیورات ہیں اور دو لاکھ روپے کی رقم بھی مگر یقین جانیں، چوری کی ہرگز نہیں ہے۔" اف گھڑوں پانی نہیں بلکہ پانی کی تیز رو آبشار تھی جو اس کے لب و لہجے اور گفتگو کی صورت میں ان پر آن پڑی۔

"اوہ... بہت سے معاملوں میں انسان اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے محترم خاتون! حالانکہ اس تباہ حال کمرے میں تو شاید آپ کے کسی ملازم کے مطلب کی بھی کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی، لیکن آپ کو یوں ٹوکنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا بلکہ میں تو آپ کے یوں بتائے بغیر اتنی خاموشی سے چلے جانے کا شکوہ کر رہا تھا۔" انہوں نے خجالت آمیز لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

"لیکن اس کے سوا میرے لیے کوئی چارہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ میں جو اچانک آپ کے سر پڑ گئی تھی، مستقلاً "آپ کے گلے کا ہار تو بننا نہیں چاہتی تھی اور نہ مجھے یہ گوارا تھا کہ میری وجہ سے آپ بھی بے ٹھکانا ہو جائیں۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ اس سے پہلے آپ نیچے آئیں... میں یہاں سے چل دوں۔"

اف اب تو صاف ظاہر تھا کہ وہ انہیں کسی مشکل میں پھنسانے کی غرض سے ان کے گلے نہیں پڑی تھی۔

"لیکن میں بھی تو اب اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ کو اس کا بخوبی علم ہے پھر آپ نے کم از کم میرے اوپر سے اترنے کا انتظار تو کیا ہوتا۔" انہوں نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔ تو وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"لیکن انتظار کرنے سے حاصل ہی کیا ہوتا کیونکہ یہاں سے باہر نکل کر ہماری راہیں جدا ہو جاتیں۔ ہاں البتہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ضرور رکنا چاہیے تھا۔" اور وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکے کہ خود ان کی زندگی کا یہ پہلو بہت کمزور تھا۔

"لیکن میری ناقص رائے یہ ہے کہ آپ کو فی الوقت اس گھر کو خیرباد نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس طرح آپ کو اپنا مستقبل سنوارنے میں بڑی دشواری پیدا ہو جائے گی اور بقول خود آپ کے اس گھر کے مکینوں کا سلوک کے آپ شروع ہی سے عادی ہیں تو پھر یہ اچانک اتنا اٹل فیصلہ کیسا؟" لڑکی نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ اٹل فیصلہ تو گزشتہ رات ہی ہو گیا تھا جب میں نے بھائی اور بھابھی جان کے سامنے اتنا سنگین جھوٹ بول کر آپ کو اپنی منکوحہ ظاہر کیا تھا۔ تو کیا آپ یہ سمجھی... ہیں کہ یہ کوئی معمولی بات ہے۔ میں اگر یہاں تنہا رہا تو یہ لوگ میری زندگی اجیرن کر دیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ میں صرف ایک رات کے لیے ایک الڑ حسینہ کو خرید کر لایا تھا۔ معاف کیجیے گا، آپ کے مخلصانہ مشورے پر مجھے اس قدر کھل کر یہ سب کچھ کہنا پڑ رہا ہے۔" انہوں نے بات کے اختتام پر معذرت بھی کر ڈالی۔

"اوہ تو پھر واقعی میری وجہ سے آپ کو بڑی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

"نہیں، میں نے کہہ تو دیا کہ میں ان ساری باتوں کا عادی ہوں لیکن آپ یہ بتائیے کہ کیا رات ہی رات میں آپ نے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کر لیا ہے جہاں آپ کو پورا پورا تحفظ مل سکے۔" انہوں نے بھی دہلیز



چھوڑ کر کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" لڑکی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟" انہوں نے پھر سوال کیا۔ لہجے سے تجسس سا نمایاں تھا۔

"دریا کی لہروں میں۔" لڑکی نے بتایا۔

"کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہیں۔"

"میرے حالات میں غیر سنجیدہ لمحہ تو کبھی آیا ہی نہیں اور آپ نے گزشتہ شب خود ہی اس بات کا مشاہدہ کر لیا ہو گا۔ میری حالت پر کوئی ترس کھانے والا ہے نہ مجھے پناہ دینے والا بلکہ میری ذات سب کے لیے مشکوک ہی ثابت ہوتی ہے، لہٰذا جہاں بھی پناہ لینے کی کوشش کروں گی وہاں مجھے ایسی ہی نفرت اور حقارت سے نوازا جائے گا۔ چنانچہ اب موت کو گلے لگانے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔" لڑکی کی آواز میں دکھ تو جھلک رہا تھا لیکن اس کا لہجہ پرعزم تھا۔ یعنی اب فواد کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ ان کا ہمدردی سے لبریز دل اس حالات کی شکار لڑکی کے لیے پگھلا جا رہا تھا۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اسے اس کے انتہائی اقدام سے باز رکھیں۔

اس سے کہیں کہ نہیں نہیں تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ میں تمہیں پورا پورا تحفظ دوں گا مگر کیسے کہتے بھلا جب کہ خود ہی بالکل تہی دست اور بے بس تھے۔ ویسے بھی ان کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کسی لڑکی سے اس قدر قریب اور ہمکلام ہونے کا۔ وہ بھی بھلا کن حالات میں۔ ایسی باتوں کو نمٹانے کی ان میں نہ سوجھ بوجھ تھی نہ کوئی تجربہ ہی... وہ کچھ دیر تو سوچتے رہے پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"شاید آپ کو یاد ہو گا، کل رات کو آپ نے کہا تھا کہ... کہ احسان کا کوئی بدل ہوتا تو آپ... آپ... ہاں کچھ ایسا ہی کہا تھا آپ نے۔" انہوں نے اپنی بات بہت ڈرتے جھجکتے کہی۔

"تو کیا آپ اپنے احسان کا بدلہ چاہتے ہیں۔" لڑکی نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، صرف ایک اسی بات کی وساطت سے خود کو یہ کہنے کا مستحق سمجھتا ہوں کہ آپ۔"

"ہاں ہاں کہیے میں حتی المقدور آپ کے ہر مطالبے کو پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔" لڑکی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کیا یہ آپ کا وعدہ ہے؟" انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں، بالکل سچا اور پکا۔"

"تو پھر اس بات کو حقیقت میں بدل دیں جو میں نے محض بہانا بنانے کے طور پر کل رات کو بھائی اور بھابی جان کے سامنے کہی تھی۔"

"جی۔" وہ مارے حیرت کے اچھل پڑی اور ان کی طرف گھوم کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں بڑی کاٹ تھی اور چہرے پر جذب کی سرخی، اتنا خوب صورت انداز کہ وہ دل تھام کر رہ گئے اور جلدی سے نگاہیں چرا کر بولے۔

"میں نے حد ادب سے بڑھ کر کوئی بات تو نہیں کی۔ البتہ چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے لیکن انوکھی بات نہیں ہے۔"

"انوکھی بات تو نہیں ہے مگر... مگر... یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔" لڑکی نے تھوڑے توقف سے نگاہیں جھکا کر کہا۔

"کیوں، کیوں ممکن نہیں۔ آخر؟ دیکھیے آپ کو تحفظ چاہیے تو وہ اپنی جان پر کھیل کر آپ کو دوں گا۔ ہاں البتہ میں بالکل تہی دست اور قلاش ہوں... مالی طور پر میں آپ کی مدد بالکل نہ کر سکوں گا مگر یہ بھی اسی وقت تک جب تک میں کچھ بن نہیں جاؤں گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ کو اسی وجہ سے انکار ہے نا۔" وہ پھر اپنی فطری سادگی سے بات کرنے لگے۔

"نہیں، بلکہ میں یہ نہیں چاہتی کہ کل کلاں کو آپ کو یہ احساس ہو کہ میں تو سچ مچ ہی آپ کے گلے پڑ گئی جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب میں نے آپ سے مدد کی درخواست کی تھی اور آپ مجھے ساتھ لے جا رہے تھے تو آپ کے دل میں یہ خیال ضرور آیا ہو گا۔"

"لیکن ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ وہ تو ایک قدرتی بات تھی ۔۔۔ مگر اس وقت تو میں اپنی مرضی اور خوشی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ کی زبردستی سے تو نہیں۔" انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے ۔۔۔ لیکن آپ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ میں کون ہوں ۔۔۔ کیا ہوں ۔۔۔ اور مجھ پر ایسی کیا بیتی ہے جو اس وقت یہاں کھڑی نظر آرہی ہوں۔" لڑکی نے ان کی نگاہوں کی زد میں آتے ہوئے چہرے کو جھکا کر کہا۔

"مجھے ایسی باتوں کو جاننے کی پروا ہے نہ تمنا۔ بس میرے دل نے آپ کی رفاقت کو منظور کرلینے پر مجھے اکسایا اور میں نے درخواست گزاری کردی۔" وہ بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

"دل کے فیصلے کبھی کبھی بڑے تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں فواد صاحب! آپ کو جب معلوم ہوگا کہ میں کون ہوں تو آپ ۔۔۔"

"مجھے کچھ بھی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ مس ۔۔۔ محترمہ۔"

"مجھے زریں گل کہتے ہیں۔"

"اوہ نام تو بہت ہی خوب صورت ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں اس کے نام کو سراہا اور بولے۔

"ہاں تو زریں گل صاحبہ! ہیرے کی پہچان اس کی تراش خراش سے ہوتی ہے' سادہ پتھر سے نہیں اور میری نگاہوں نے آپ کے اندر چھپی صلاحیتوں کو پہچان لیا ہے۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں زریں گل۔"

مگر زریں گل نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں صرف درخواست ہی کرسکتا ہوں زریں گل! اصرار نہیں۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ ملتجی سے انداز میں بولے۔ دل میں اچانک ہی اس کی محبت کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"عجلت میں کیے فیصلے عموماً منفی نتائج کے حامل ہوتے ہیں فواد صاحب! اور مشکل تو یہ ہے کہ آپ کے پاس سوچنے اور غور کرنے کا بھی وقت نہیں ہے۔" وہ ان کی قربت سے بچنے کے لیے تیزی سے گھوم کر پلنگ کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"جب وقت پر دسترس نہ ہو تو سوچنا سمجھنا بیکار ہوتا ہے زریں گل! آپ صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ آپ کو مجھ جیسے بے مایہ اور ادھورے سے انسان کی رفاقت بالکل منظور نہیں۔ یقین مانیں' میں بالکل برا نہ مانوں گا کیونکہ زبردستی اور جبر کا میں بالکل قائل نہیں ہوں۔ اصل میں تو یہ رشتے دلوں کی ہم آہنگی اور آمادگی پر ہی استوار ہوتے ہیں' کسی کو مجبور کر کے نہیں۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر دروازے کے آگے ہی ٹہلتے ہوئے بولے اور لڑکی پلنگ کی طرف رخ کیے انگلی میں پڑی قیمتی انگوٹھی کو تکتی رہی۔

"ٹھیک ہے تو پھر آیئے چلتے ہیں۔ بس میں ذرا اپنی چند ضروری چیزیں اور لے لوں۔" اپنی بات کہہ کر وہ پلنگ کے نزدیک آئے تو وہ تھوڑا سا ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے پلنگ کے نیچے سے ایک پرانا سا بکس گھسیٹا جس میں ان کے کپڑے رکھے تھے۔ اسی میں انہوں نے جلد جلد اپنی کتابیں بھریں' شیو کا سامان رکھا اور پھر تکیے پر پڑا تولیہ اٹھا کر اپنے سلیپر اور جوتے اس میں باندھے اور پھر اس سے فارغ ہو کر انہوں نے زریں گل سے کہا۔

"آیئے چلیے۔" لیکن زریں گل نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔

"میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا اور پھر ان کا جواب سنے بغیر شروع ہوگئی۔

"میں ایک اچھے خاصے' کھاتے پیتے خاندان کی لڑکی ہوں اور اپنے والدین کی اکلوتی۔ والدہ کا انتقال میری صغر سنی میں ہی ہوگیا تھا والد نے کچھ دن تو میری نازبرداریوں میں گزارے پھر عمر اور نفس کے تقاضے سے مجبور ہو کر دوسری شادی کرلی۔ سوتیلی والدہ نے حسب عادت مجھ سے وہی سلوک کیا جو عام طور پر سوتیلی ماں اپنی سوتیلی اولاد سے روا رکھتی ہے لیکن والد کا رویہ پھر بھی بہتر تھا۔ انہوں نے ہی ماں کی مخالفت کے باوجود مجھے پڑھایا لکھایا تھا اور ابھی میں نے میٹرک پاس ہی کیا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا اور یوں مجھ پر ظلم و تشدد کے باب کھل گئے۔ ماں نے صرف سختیاں ہی نہیں کیں بلکہ مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے ہمارے ہی قبیلے کے ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا۔ پھر وہ شخص راتوں رات مجھے یہاں لے آیا اور دو ماہ تک ایک نائکہ کی نگرانی میں مجھے اس گھر میں رکھا اور آج صبح اس نے ایک سیٹھ ساہوکار کے ہاتھ مجھے دو لاکھ روپے میں فروخت کردیا تھا۔ یہ سودا اسی قسم کا تھا جو ایک جوان اور کنواری طوائف کی تھنی اتارنے کی رسم کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔" زریں گل اپنی بپتا سنا کر خاموش ہوئی تو فواد نے کہا۔

"لیکن یہ تو کوئی ایسی قابل گرفت بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے' آپ کو مجبور اور بے بس دیکھ کر آپ کا سودا کیا گیا تھا اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے مجھے آپ کا مددگار بنا کر عین موقع پر بھیج دیا یا پھر مجھے آپ جیسی ہیرا صفت خاتون سے نواز دیا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ "آپ ان خدشات اور وسوسوں کو فوراً اپنے دل سے نکال دیں۔ فواد کو آپ ہر حالت اور ہر صورت میں قبول ہیں۔" انہوں نے آہستہ سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا ایک ایسی لڑکی جس کی قیمت لگ چکی ہو ۔۔۔ جو بکاؤ مال کی طرح ہو۔" وہ اشکوں سے بوجھل آواز میں بولی۔

"ہاں ایسی ہی لڑکی۔ کیوں کیا آپ کو محبت کا یہ سودا منظور ہے جو فواد آپ سے کررہا ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کے شانوں پر دباؤ ڈال کر پوچھا۔ اف پہلی بار ایک مرد نے پیار کا رس کانوں میں گھولا تھا۔ وہ کتنا کھرا' سچا اور سادہ لوح تھا۔ اس کا اندازہ زریں کو اس کی سیدھی سادی گفتگو اور کردار کے ٹھوس پن سے ہی ہوگیا تھا اور پھر وہ تو بہت پہلے ہی اس کے من میں بس چکا تھا۔ مارے خوشی کے زریں کی آنکھوں میں بدلیاں سی اتر آئیں جنہیں پی کر اس نے دھیرے سے کہا۔

"جی منظور ہے۔ دل و جان سے منظور ہے۔" اور اقرار کے اس محجوب سے انداز پر وہ خوشی سے دیوانے ہوا ٹھے۔ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور سینے سے لگانا ہی چاہتے تھے کہ وہ ان کا ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"ابھی آپ مذہبی اور قانونی حیثیت سے اتنی بے ساختگی کے مستحق نہیں ہیں۔" لہجے میں نسوانی حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ہلکی سی فہمائش بھی تھی۔

"اوہ ہاں ہاں سوری ۔۔۔ دراصل خوشی کی بے پایاں کیفیت میں مجھے اس نزاکت کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔" وہ خجل سے ہو کر بولے ۔۔۔ اور تبھی قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو انہوں نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اے رب رحیم! میں تیری نوازشوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ تو نے میری زندگی کو آج ایک خوب صورت موڑ سے نوازا ہے۔ تو مجھے اس نئی راہ پر ثابت قدمی سے چلنے کی توفیق عطا فرما۔" اور پھر انہوں نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرنے کے بعد زریں سے کہا۔

"آیئے اب چلتے ہیں۔ آج کے دن کا آغاز ہم اپنے اس اٹوٹ رشتے کو مستحکم کرکے ہی کریں گے۔" اور تب زریں گل نے وہ پوٹلی جو اس کے بقول اس کی کل متاع تھی۔ ان کے قدموں میں ڈال دی۔

"آج کے مبارک دن کی خوشی میں یہ حقیر سا نذرانہ ہے ملک فواد۔" اس نے عقیدت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو وہ پوٹلی کے پاس سے یوں ہٹے جیسے وہ پوٹلی نہیں سانپ کی پٹاری ہو۔

"اسے ۔۔۔ اسے اٹھا لیجیے زریں گل! اور آئندہ کبھی اسے اپنے اور میرے درمیان نہ لایئے گا کیونکہ یہ اغراض محبت ہی ثابت ہوگی ویسے بھی مجھے اپنے زور بازو پر بھروسا ہے۔ میں محنت کروں گا' مزدوری کروں گا حتیٰ کہ اینٹیں تک اٹھاؤں گا۔ یعنی آپ کو کبھی بھوکا نہیں رکھوں گا۔" انہوں نے بڑے پرعزم لہجے میں کہا تو زریں گل نے جھک کر وہ پوٹلی اٹھائی پھر دونوں باہر نکل آئے۔ مگر برآمدے میں آتے ہی جواد صاحب کو وہاں ٹہلتا دیکھ کر دونوں کی جان ہی نکل گئی۔

"کہاں جارہے ہو؟" انہوں نے کڑک کر پوچھا۔

”جہاں قسمت لے جائے گی بھائی جان۔“ وہ بھائی کو سلام کرنے کے بعد بولے۔

”ہونہہ قسمت لے جائے گی۔ قسمت کے رحم و کرم پر خود کو چھوڑ دینے والے ہمیشہ ناکام ہی رہتے ہیں۔ قسمت تدبیر اور محنت سے بنتی ہے ملک فواد! اور تیرے پاس تو نہ گھر ہے نہ در ہے اور نہ پیسہ۔ چلا ہے قسمت کے سہارے بیوی کو لے کر۔ کیا اسے فٹ پاتھ پر سلائے گا؟“ انہوں نے لتاڑنے کے سے انداز میں کہا۔

”نہیں بھائی جان! میں قدرت کی کرشمہ سازی کا قائل ہوں۔ جب وہ کسی کو بھوکا نہیں رکھتی تو بے گھر اور بے در بھی نہ رکھتی ہوگی۔“ وہ بڑی بے فکری کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

”اوہو! کیسی کترنی کی طرح زبان چل رہی ہے۔ چل رکھ یہ بکسا۔“ انہوں نے پیار سے جھڑک کر کہا اور پھر ملازمہ کو جو صحن سے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی آواز دی۔

”اوئے فیضاں۔“

”جی میاں جی۔“ فیضاں نے چلتے چلتے رک کر وہیں سے جواب دیا۔

”وہ باری والا کمرہ ہے نا اس میں نواڑی پلنگ بچھوا دے۔ یہ دونوں اب اسی کمرے میں رہا کریں گے۔“ اور فیضاں جس کا منہ فواد کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ڈھیلے سے لہجے میں بولی۔

”اچھا جی۔“

”ہاں اور اپنی ملکانی سے بھی کہہ دینا کہ میں نے وہ کمرہ ان دونوں کو دے دیا ہے۔ یہ تیرا چھوٹا ملک اپنی بیوی کو گھر لایا ہے ’اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔‘“ انہوں نے گویا یہ کہہ کر ملازمہ کا تجسس دور کر دیا اور فیضاں اپنے سارے کام چھوڑ کر ان کا کام کرنے چل دی۔

”چلو جاؤ تم دونوں اپنے اس کمرے میں۔“ جواد صاحب نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا اور پھر فوراً ہی اندر چلے گئے۔

”کہیے اب تو آپ نے مان لیا ہوگا قدرت کی کرشمہ سازی کو۔“ بھائی کے جاتے ہی انہوں نے زریں گل سے کہا۔

”جی ہاں لیکن میں آج سے نہیں ہمیشہ ہی سے جانتی ہوں۔“

زریں نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور پھر دونوں اس کمرے میں چلے آئے جو چھوٹا ضرور تھا مگر بہت صاف ستھرا اور ہوادار تھا اور جس میں چھت کا پنکھا بھی لگا ہوا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ اس روز تو نہیں دوسرے روز انہوں نے کسی نہ کسی طور پر ایک قاضی کا پتا لگا یا اور وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

*_*_*

ملک جواد نے اپنے طور پر تو بھائی کے ساتھ بڑی رعایت برتی تھی کہ انہیں اپنے گھر کا ایک معقول کمرہ رہائش کے لیے دے دیا تھا۔ گھر میں جو کچھ بھی پکتا' وہ اس میں چھوٹے بھائی اور بھاوج کو بھی شریک کر لیتے۔ مگر ناصرہ بیگم کو میاں کی یہ نرمی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ جھوٹی سچی باتیں میاں کے کانوں میں ڈال کر انہیں ورغلاتی اور بھڑکاتی ہی رہتی تھیں۔ حالانکہ گھر میں دو ملازمائیں اور ایک ملازم بھی تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ سارا کھانا زریں گل سے ہی پکواتی تھیں اور ایک ذرا سی چوک پر لاکھوں فضیحتے' لعن طعن' کوسنے اور گالیاں مگر اس کے حالات ہی ایسے تھے کہ وہ یہ سارے جور و ستم چپ چاپ سہہ لیتی حتیٰ کہ فواد کو بھی نہ بتاتی کہ فواد ان دنوں اپنے حالات سے جہاد کر رہے تھے۔ وہ پڑھ بھی رہے تھے۔ ٹیوشنز بھی پڑھا رہے تھے اور بلدیاتی ادارے میں مزدوری بھی کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ اپنا اور اپنی شریک حیات کا بار بھائی کے کاندھوں پر ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے حصے کا راشن بھی ہر ماہ لا کر ڈلواتے تھے۔ اس کے باوجود بھی ناصرہ بیگم کی تیوری کا بل سیدھا نہ ہوتا تھا۔ ان کے لیے تو دیور کا وجود شروع ہی سے ناقابل برداشت تھا اور ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا پھر بھلا وہ دیور کے ساتھ اس کی بیوی کے وجود کو کیسے برداشت کر لیتیں۔

ملک جواد کے والد جالندھر کے رہنے والے تھے۔



ان کا وہاں ایک چھوٹا سا زمیندارہ تھا اور تھوڑی سی جائیداد بھی۔ بڑے دیندار اور خدا ترس انسان تھے۔ اس لیے تقریباً سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں سب سے بڑے ملک جواد۔ ان سے چھوٹی دو لڑکیاں' طاہرہ اور عابدہ' پھر ایک لڑکا شہزاد اور سب سے چھوٹا فواد۔ ملک اللہ یار کا گھرانا خاصا کھاتا پیتا اور خوشحال تھا۔ لڑکے تعلیم پا رہے تھے اور لڑکیاں امور خانہ داری نبھا رہی تھیں۔ کیونکہ ملک اللہ یار کی بیوی کا فواد کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ پھر جب ملک جواد نے مقامی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کر لیا تو بڑے ملک نے انہیں زمینوں کی دیکھ بھال کے کام پر لگا دیا۔ لڑکیاں بھی اس عرصے میں جوان ہو چکی تھیں اور طاہرہ کی برادری میں ایک جگہ نسبت ٹھہر گئی تھی۔ البتہ عابدہ ابھی چھوٹی تھی یہی کوئی دس گیارہ سال کی وہ اور شہزاد جڑواں تھے اور فواد کی عمر صرف سات آٹھ سال کی تھی کہ ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ سیاسی پارٹیوں اور برٹش سامراج کے درمیان طے تو یہی پایا تھا کہ جالندھر پاکستان کے حصے میں جائے گا۔ مگر یہ بھی انگریزی شاطر حکمرانوں اور کانگریس کی ایک چال تھی جس کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب ملک تقسیم ہو گیا اور جالندھر کو پاکستان سے کاٹ کر بھارت کے قبضے میں دے دیا گیا۔ پھر تو وہ خون خرابا ہوا کہ خدا کی پناہ' ہندو اور سکھ جو کہ پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے جالندھر کے بے گناہ اور بے ضرر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ملک اللہ یار بھی بری طرح ان فسادات کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان کی ساری املاک لوٹ لی گئی حتیٰ کہ ہندو اور سکھ درندوں نے ان کے ناموس کی بھی دھجیاں اڑا دیں۔ شہزاد بھی بہنوں کو بچانے کی کوشش میں شہید ہو گیا۔ اور ملک اللہ یار کسی نہ کسی طرح اپنی اور اپنے دونوں بیٹوں جواد اور فواد کی جان بچا کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کر پاکستان پہنچ گئے۔ جو کچھ سمیٹا جا سکا تھا' وہ ایک گٹھڑی میں باندھ لائے تھے اس سے پرچون کا ایک چھوٹا سا کھوکھا کھول لیا تھا اور بس اسی پر گزر بسر ہو رہی تھی ادھر جواد بھی ایک عرصے تک سرگرداں رہے تھے۔ پھر ایک روز ان کی قسمت نے یاوری کی کہ حکومت کی طرف سے کلیم کا متبادل حکم نامہ جاری ہو گیا اور انہوں نے بھی بھاگ دوڑ کر کے کسی نہ کسی طرح اپنا کلیم حاصل کر لیا اور یوں قدرے آسودہ حالی سے گزر بسر ہونے لگی۔ ملک جواد نے لاہور پہنچتے ہی فواد کو ایک گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا تھا اور وہ چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ بہت ذہین اور ہونہار تھا۔ اس لیے اپنے ضائع شدہ سالوں کی کمی محنت کر کر کے پوری کر لی تھی۔ باپ تو جالندھر چھوڑنے کے بعد ہی ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے تھے۔ اکٹھی تین تین جوان اولادوں کی مفارقت کا غم اتنا بڑا سانحہ تھا کہ ان کا دماغ بھی تھوڑا تھوڑا بہک گیا تھا۔ ہر دم خاموش' کھوئے کھوئے اور گم صم سے رہتے تھے۔ پھر بھی جانے کیونکر سات آٹھ سال کھینچ گئے۔ ان کے انتقال کے بعد جواد جن کے کاندھوں پر شروع سے ہی باپ نے یا حالات نے فواد کی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ کلیتاً اس کے سرپرست اور کفیل بن گئے تھے۔ ان کی شادی باپ کی زندگی میں ہی ناصرہ بیگم سے ہو گئی تھی۔

ناصرہ بیگم بھی پٹیالہ کے ایک غریب مہاجر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور بالکل پڑوس کے مکان میں رہتی تھیں۔ نحستی میں برخورداری۔ ان کے والدین بھی کثیر اولاد تھے۔ پانچ بہنیں اور تین بھائی مگر غربت کی وجہ سے تینوں بھائی ناکارہ اور نکمے تھے۔ دو بڑی بہنوں شادیاں ہو چکی تھیں۔ ناصرہ بیگم حسین و جمیل نہ سہی خوش شکل ضرور تھیں اور سب سے بڑھ کر سخت چلتر اور چالاک ۔۔۔ ماں نے دیکھا کہ پڑوس میں ایک جوان' شریف اور آسودہ حال لڑکا رہتا ہے۔ گھر میں کوئی عورت بھی نہیں ہے تو بیٹی کو اکسایا کہ اس پر ڈورے ڈالے جبکہ لڑکا سخت نروٹھا اور خشک مزاج تھا اور کسی حد تک غمزدہ بھی۔ وہ ہر دم فکر روزگار میں ہی جتا نظر آتا تھا مگر تھا تو چڑھتی جوانی کے دور میں۔ ادھر ڈورے بھی کچھ اس قدر ڈرامائی انداز میں ڈالے گئے تھے۔ وہ جلد ہی ناصرہ بیگم اور ان کی ماں کے دام میں آ گیا اور پھر وہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات

ہوئی۔ کیونکہ ملک اللہ یار تو ہمیشہ سے حلیم اور خدا ترس تھے۔ اس پر تقریباً" ہر بات سے ہی بری الذمہ ہو گئے تھے۔ بیٹے نے ڈرتے ڈرتے بہت مودبانہ شادی کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے فوراً" ہی اجازت دے دی۔ مگر ناصرہ بیگم کی نظروں میں سسر اور دیور کا وجود سخت کھٹکتا تھا اور وہ دل سے سسر کی موت کی تمنائی تھی۔ شوہر کو شروع ہی سے ایسا قبضے میں کیا تھا کہ وہ بیوی کی کسی بات پر نہ نہیں کرتے تھے۔

بہرحال شادی کے دو سال بعد ان کی دلی تمنا بر آئی اور سسر کا کانٹا ان کی راہ سے خود بخود صاف ہو گیا اور پھر تو ان کی بن ہی آئی۔ انہوں نے فواد پر ستم توڑنے شروع کر دیے۔ اس سے گھر کے سارے کام کراتیں اور ہر وقت اسے گالیوں' کوسنوں اور جوتیوں سے نوازتی رہتیں۔ انہوں نے بہت چاہا کہ وہ پڑھائی چھوڑ دیں۔ لیکن جواد صاحب نے اس معاملے میں ان کی ایک نہ چلنے دی وہ اس لیے کہ ان کے والد نے مرتے وقت انہیں وصیت کی تھی کہ فواد کا خیال رکھنا' اسے خوب تعلیم دلوانا اور اس کے بالغ ہونے کے بعد اس کا حصہ اسے ضرور دے دینا تو جواد صاحب فواد کے لیے بیوی کی وجہ سے اور کچھ تو نہیں کر سکے تھے' البتہ اسے تعلیم ضرور دلواتے رہے تھے۔ ورنہ خود انہوں نے بھی بیوی کی باتوں میں آ کر بھائی کی کتے کی سی ادر کر رکھی تھی۔ فواد کو ہر معاملے میں اتنی محرومیاں ملی تھیں اتنی زیادہ کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو یقیناً" بگڑ ہی جاتا مگر وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی محرومیوں کا انتقام دوسروں سے اور اپنی ذات سے لیتے ہیں اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر ڈال دیتے ہیں بلکہ وہ تو فطرتاً" بہت مسکین اور خاموش طبع تھے اور تقدیر کا لکھا سمجھ کر اپنے انہیں حالات پر صبر و شکر کر لیتے تھے۔

ناصرہ بیگم نے ان کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کر لیے تھے۔ کئی کئی وقت تک بھوکا رکھنا۔ ایذائیں دینا۔ ان کی بساط سے بڑھ کر کام لینا۔ مارنا پیٹنا' کوسنا کاٹنا حتیٰ کہ تعویذ گنڈے اور سفلی عمل بھی کر کے دیکھ لیا تھا۔ اور اسی پر ہی بس نہیں چلا تھا تو ایک دفعہ اپنے بھائی کو سکھا پڑھا کر برستی بارش میں فواد کو اس کے ساتھ اوپر چھت پر پانی کی ٹنکی کا ڈھکنا بند کرانے کے بہانے بھیجا تو ان کے بھائی نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فواد کو ٹنکی میں دھکا دے دیا۔ ٹنکی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ ایک دم ہی وہ پانی میں گرے تو ان کے پیر بھی ٹنکی کی تہہ پر نہ جم سکے۔ مگر انہوں نے تیزی سے پانی سے ابھر کر کہ سانس گھٹ رہا تھا' ٹنکی کے کنارے لگے ہوئے نلکے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا اور اسی کا سہارا لے کر دوسرے ہاتھ سے ٹنکی کا کنارہ پکڑ کر جوں ہی اوپر آنا چاہا۔ ناصرہ بیگم کے بھائی نے جو ٹنکی پر جھکا ہنسے جا رہا تھا ان کے سر پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں پانی میں ڈبو دیا پھر یہی ہوتا رہا کہ جونہی وہ پانی سے سر نکال کر اوپر آنا چاہتے۔ ناصرہ بیگم کا بھائی ان کے سر کو دبا کر انہیں پانی میں ڈبو دیتا۔ یہ سلسلہ تقریباً" آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ بار بار پانی میں ڈبکیاں کھانے کی وجہ سے فواد کی ناک کان اور آنکھیں درد سے پھٹنے سی لگیں۔ سارا جسم دکھنے لگا اور چہرہ تانبے کی طرح تپنے لگا۔ یہ تنگ آ کر رونے لگے تو چونکہ ان کی زندگی باقی تھی۔ اس لیے ناصرہ بیگم کے بھائی کو ان پر ترس آ گیا۔ وہ ہنس کر بولا۔

"یار! تو تو بڑا سخت جان ہے۔ قسم سے تیری جگہ اگر میں ہوتا تو کب کا گزر چکا ہوتا۔ چل نکل باہر۔" اور تب آنکھوں میں آنسو بھرے فواد اس کے ہاتھ کو پکڑ ٹنکی سے باہر نکل آئے اور بھاگتے ہوئے اپنی اسی کوٹھڑی میں آ گئے۔ ان دنوں ویسے بھی موسم خراب تھا اور گھر گھر بخار اور زکام وغیرہ پھیلا ہوا تھا۔ اتنی دیر تک پانی میں رہنے کی وجہ سے گیلے کپڑے اتارتے اتارتے انہیں بخار چڑھ گیا اور پھر وہ کئی روز تک بے سدھ پڑے رہے۔ مگر کسی نے بھی پلٹ کر کر انہیں نہیں پوچھا سوائے رکھی کے۔

رکھی جس کا باپ دادا۔ اسی خاندان کا پروردہ تھا اور جو خود بھی اسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور پروان چڑھی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد ان کی شادی اسی کی برادری کے ایک شخص سے کر دی گئی تھی مگر اس کا



شوہر چند سال ہی زندہ رہا تھا اور بیوہ ہونے کے بعد رکھی اپنی اکلوتی شیر خوار بچی جیراں کو لے کر پھر اپنے آقا ملک اللہ یار کے یہاں آ گئی تھی اور وہی ایک واحد ہستی تھی جو فواد کا خیال رکھتی تھی۔ اپنی بد مزاجی اور ملازموں سے ناروا سلوک کی وجہ سے ناصرہ بیگم رکھی کو بالکل نہیں بھاتی تھی۔ وہ نمک حلال ہی نہیں ملکوں کے خاندان پر جان نثار کر دینے والی ہستی تھی اور اپنے آقاؤں کا دکھ درد اپنے سینے میں محسوس کرتی تھی۔ وہ ناصرہ بیگم سے اس لیے بھی خار کھاتی تھی کہ ناصرہ بیگم اس کے آقاؤں کا پیسہ اپنے میکے والوں پر جو پڑوس میں رہتے تھے لٹاتی تھیں۔ بہرحال فواد کی تھوڑی بہت تیمارداری کرتی رہی کیونکہ ملکانی کے عتاب کے ڈر سے کھل کر وہ بھی فواد کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی اور جیسا کہ فواد نے تہیہ کیا تھا کہ ناصرہ بیگم کے بھائی کی شکایت اپنے بھائی سے ضرور کریں گے تو گھر والوں کی اس قدر بے حسی اور بے پروائی دیکھ کر انہوں نے بھائی سے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا بلکہ الٹا بھاوج کے کوسنے اور برا بھلا ہی سنا۔

خیر ان دنوں تو وہ کل تیرہ چودہ برس کے تھے اور اتنے سیدھے اور بیوقوف کہ ہر کسی کی باتوں میں آ جاتے تھے اور ایک رکھی ہی تھی جو انہیں اونچ نیچ سمجھایا کرتی تھی۔ جبکہ زندگی' وقت' حالات اور زندگی کے تلخ تجربات خود ہی بے وقوف سے بے وقوف انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔

ناصرہ بیگم کی شادی کو سات سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور اس عرصے میں ان کے دو کچے بچے ضائع ہو چکے تھے اور اب وہ پھر امید سے تھیں اور جواد صاحب چاہتے تھے۔ پہلوٹھی کی ہی نہیں ان کی تمام اولادیں ہی نرینہ ہوں۔ یوں تو ویسے بھی پست ذہنیت اور کج فہم لوگ۔ نرینہ اولاد کے متمنی ہوتے ہیں۔ اگر پہلوٹھی کی اولاد لڑکی ہو تو ان کی گردنیں شرم سے جھک جاتیں' ان کی ساری خوشیوں پر پانی پھر جاتا ہے اور بعض عقل کے پورے اپنی بیویوں کو لعن طعن اور عتاب کا نشانہ بناتے ہیں کہ اس نے پہلی اولاد لڑکی کیوں پیدا کی۔ جبکہ ارشاد خداوندی ہے کہ جس عورت کے یہاں پہلی اولاد لڑکی ہوتی ہے' وہ نہ صرف بھاگوان ہوتی ہے بلکہ خدا کے یہاں اس کا درجہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جواد کا مسئلہ کچھ نفسیاتی سا تھا۔ چونکہ وہ اپنی دونوں جوان بہنوں کا المناک انجام دیکھ چکے تھے اس لیے لڑکی کے تصور سے ہی دور بھاگتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکی تو چوراہے پر رکھا خزانہ ہوتی ہے۔ جس کی حفاظت کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہی ہوتا ہے اور پھر حسن اتفاق سے ان کی بیوی نے ایک لڑکے کو ہی جنم دیا اور اس وجہ سے ان کی نظروں میں بیوی کی قدر و منزلت اور اہمیت بہت بڑھ گئی۔ تیمور کی ولادت کے بعد تو وہ سیاہ کرتیں یا سفید انہیں کسی بات سے کوئی غرض ہی نہ ہوتی تھی اور چھوٹے بھائی کی طرف سے تو وہ ایسے بے غرض اور لاپروا ہو گئے تھے کہ جیسے اس کا گھر میں کوئی وجود ہی نہ ہو اور یوں ناصرہ بیگم کی بن آئی تھی۔ انہوں نے خود ہی اپنی مصلحتوں کے تحت اپنی بڑی بہن زبیدہ کے لیے جو فواد سے چند سال بڑی ہی تھی اور اپنی غربت اور معمولی شکل و صورت کی وجہ سے اب تک کنواری ہی بیٹھی تھی' زبان دے دی تھی۔ وہ فواد سے اس کی شادی کریں گی بس ذرا وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ جبکہ میٹرک کے بعد خود انہوں نے ہی فواد کے کالج میں داخلہ لینے کی سخت مخالفت کی تھی۔ بھائی بھی بیوی کی زبان بولتے تھے اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی مزید تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اور تب فواد نے خود ہی اپنے لیے ایک دو ٹیوشنیں ڈھونڈ کر کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور اب اس طرح محنت کر کر کے پڑھتے پڑھتے بی اے فائنل میں آئے تھے تو اچانک اتنے خفیہ طور پر شادی رچا بیٹھے تھے۔ اور اس پر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جواد صاحب نے بھائی بھاوج کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت بھی دے دی۔ حالانکہ ناصرہ بیگم نے واویلا تو بہت مچایا مگر جواد صاحب نے ان کی اس بات کا بالکل نوٹس نہیں لیا۔ تو اب ان کا سارا نزلہ بے چاری زریں گل پر ہی گرا۔

ہر وقت کی دردر۔ پھٹ پھٹ' گالیاں کوسنے' **لعن** طعن۔ کھانا پکانا اور بچوں کو سنبھالنا اور بات بے بات

کے فصیحتے سنتا گویا زریں گل کا مقدر بن کر رہ گیا۔ مگر وہ انتہائی زیرک اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔ کبھی جواب دینا تو کجا فواد کے سامنے بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔ لیکن خود فواد کو سب کچھ معلوم تھا کہ ان کے ساتھ وہ بھی کس قدر ذلت اور خواری کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کتنی کلفتیں اٹھا رہی ہے۔ شادی کے بعد فواد نے تلاش بسیار کے بعد دو ٹیوشنز اور حاصل کر لی تھیں اور پھر کالج کے اوقات کے بعد وہ ایک بلدیاتی ادارے میں مزدوروں کی تنخواہ بانٹنے کا کام بھی کرتے تھے' جس کا معاوضہ بہت قلیل تھا مگر تاں سے ہاں ضرور ہو جاتی تھی۔ اس لیے بہت ہی غنیمت تھا اور بھائی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس لیے مہینے میں دو تین مرتبہ پیسے جمع کر کے اپنے حصے کا راشن بھی ڈلوا دیا کرتے تھے مگر ناصرہ بیگم کی تیوری کا بل پھر بھی سیدھا نہ ہوتا تھا۔

فواد کی حیثیت گھر میں خواہ کیسی بھی تھی لیکن عزیز رشتے داروں اور برادری میں وہ ملک اللہ یار کے چھوٹے بیٹے ہی مانے جاتے تھے' اس لیے ذات برادری میں ان کی بیوی کی اہمیت بھی وہی تھی جو ناصرہ بیگم کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ زریں گل کی خوب صورتی اور خوش اخلاقی کے چرچے بھی۔ تقریباً سب ہی ان کے ساتھ ناصرہ بیگم کے ناروا سلوک سے واقف تھے۔ جو ذات برادری والا آتا' ناصرہ بیگم کو نظر انداز کر کے زریں گل کی طرف ہی جھکتا۔ جبکہ ناصرہ بیگم زریں گل کے خلاف سب کے کانوں میں زہر ہی اگلتی رہتیں۔ اس کے باوجود بھی رشتے داروں کو انہیں اتنی اہمیت دیتا دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور خصوصاً" اس وقت جب رشتے دار زریں گل کو بہت اصرار سے اپنے یہاں آنے کو کہتے۔ مگر زریں گل کم ہی کہیں جاتی تھی کیونکہ اس کے پاس معقول لباس نہیں ہوتا تھا۔ چاہتی تو اپنے پیسے سے بہت کچھ بنا سکتی تھی مگر اپنا پیسہ خرچ کرنے میں شوہر کی انا کا سوال آڑے آجاتا تھا۔ اس لیے شوہر کے ہی بنائے ہوئے موٹے جھوٹے دو تین جوڑوں میں گزر بسر کرتی آرہی تھی۔

پھر ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ملک فواد کی سگے پھوپھی زاد بھائی نے جو چند ماہ پیشتر ہی سیالکوٹ سے ٹرانسفر ہو کر لاہور آئے تھے۔ اپنے بیٹے کے عقیقے کی تقریب میں ملک برادران کو مدعو کیا تو بہت اصرار سے زریں گل کو اس تقریب میں آنے کی تاکید کی اس کے باوجود زریں گل کسی طور پر اس تقریب میں شرکت کے لیے آمادہ نہ ہوئیں۔ جیٹھانی کے ساتھ جہاں بھی جاتی تھیں جیٹھانی کے ہاتھوں انہیں خوار ہی ہونا پڑتا تھا۔ لیکن فواد اپنے پھوپھی زاد کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے' اس لیے وہ زریں گل کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے اور یہ زریں گل کی بدقسمتی ہی تھی کہ دعوت میں موجود ایک عورت نے زریں گل کو پہچان لیا اور جب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ فواد کی بیوی ہے تو اس نے ناصرہ بیگم سے کہا۔

"اے یہی موئی چکلے پر بیٹھنے والی رہ گئی تھی تمہارے بھائی کے مقدر میں۔ یہ تو زمان خان کی لڑکی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ میری خالہ کے پڑوس میں رہتی تھی۔ یہ گھر سے بھاگ کر کوٹھے پر جا بیٹھی تھی یہ تو نگو طوائف ہے۔ اے تمہاری کیا مت ماری گئی تھی جو اسے اپنے گھر میں رکھ کر اپنی عزت کو بٹہ ہی لگا لیا۔"

یہ سننا تھا کہ ناصرہ بیگم جو کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں بیٹھی تھیں وہیں بھری محفل میں انہوں نے حشر برپا کر دیا۔ سب کے سامنے زریں گل کا کچا چٹھا کھول کر اسے کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رکھا۔

"نہیں نہیں بھابھی جان! میں طوائف نہیں ہوں۔ آپ کو کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔" اس نے شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

"آپ سے کس نے کہا ناصرہ باجی۔ ذرا آپ اسے ہم سے بھی تو ملوایئے۔" فواد کے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی بولیں۔

"ہاں ہاں' ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ وہ تمہارے سیالکوٹ کی ہی رہنے والی ہے۔ بلکہ تمہاری مہمان



ہے' وہ ملک فضل دین کی سالی۔ شاہدہ پروین۔" ناصرہ بیگم بہت تن کر بولیں۔ لیکن جب اسے بلوایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جا چکی ہے حالانکہ اب تک کھانا بھی سرو نہیں ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے' وہ بھاگ گئی ہے تو میں بعد میں اس سے سمجھ لوں گی۔" پھوپھی زاد بھائی کی بیوی بولیں۔

"اے تم کیا سمجھ لو گی۔ ناک تو سارے خاندان میں ہماری کٹی ہے اس موئی بیسوا کو گھر میں رکھ کر۔ ایسی ہی اس سے ہمدردی ہے تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لو تم ہی جیسوں میں یہ کھپ بھی جائے گی۔"

ناصرہ بیگم چیخ کر بولیں اور اس بات پر پورا جھگڑا ہی کھڑا ہو گیا۔ پھوپھی زاد بھائی کی بیوی نسرین نے جو ملک برادری کی تھی۔ ناصرہ بیگم کو ایسی بے نقط سنائیں کہ انہیں اس کے گھر سے بھاگتے ہی بنی۔ مگر دل میں غصے اور حسد کی ایک بھٹی سی سلگ رہی تھی۔ گھر آکر تو انہوں نے وہ ہنگامہ مچایا کہ ملک جواد جو کسی وجہ سے اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ بیوی کی زبانی زریں گل کا سارا حال احوال سن کر اپنے آپے میں نہ رہے اور مکوں اور لاتوں سے فواد کی تواضع کرتے ہوئے بولے۔

"کیوں بے تجھے غلاظت کے ڈھیر سے یہ گندگی ہی اٹھانی رہ گئی تھی۔ میری عزت کو خاک میں ملانے اسے یہاں کیوں لایا۔ بتا مردود۔۔۔"

اور تب اس روز زندگی میں پہلی بار فواد کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے بھائی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! چھوٹے' بزرگوں کا اسی وقت تک ادب کرتے ہیں جب تک بزرگوں کو چھوٹوں کا لحاظ رہتا ہے اور آپ ہر لحاظ ختم کر چکے ہیں اور آج میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ یہ ساری آگ بھابھی جان کی لگائی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہی یہ سارا فتنہ کھڑا کیا ہے اور یہ بھری محفل میں نسرین بھابی سے بھی لڑ کر آئی ہیں' اصل میں تو زریں کو یہاں سے بھگا دینا چاہتی ہیں اور ان کا رویہ شروع سے میرے ساتھ جیسا بھی رہا ہے' اس سے آپ لاعلم نہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر آپ کے خیال میں میں زریں کو گندگی کے ڈھیر سے اٹھا کر لایا ہوں تو یہ نہ بھولیے کہ اب وہ میری بیوی ہے اور اب میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کا متحمل نہ ہوں گا۔" اور ان کی اس جرات رندانہ پر ملک جواد ششدر سے انہیں دیکھتے رہ گئے اور بے یقینی کی انتہائی شدید کیفیت میں ناصرہ بیگم جیسی چرب زبان عورت سے بھی کوئی جواب نہ بن سکا اور فواد دونوں کو ان کی اپنی اپنی حالتوں میں چھوڑ کر تیزی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

بھائی اور بھاوج کے سامنے برسوں کی جمع شدہ دل کی بھڑاس تو نکال آئے تھے مگر غصہ ابھی کم نہ ہوا تھا۔ بھری محفل میں اتنی بے عزتی ہوئی تھی کہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اسی میں سما جائیں۔ حالانکہ زریں گل ان الزامات کی تردید ہی کر رہی تھی اور نسرین ان کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔ بلکہ آدھی برادری ہی زریں کی طرف دار تھی۔ پھر بھی وہ الجھ کر رہ گئے تھے۔ شرمندگی تو پہلے ہی کھسیاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی' گھر آکر بھاوج نے جو فساد مچایا تو ان جیسے بے پتا انسان کا خون بھی کھول اٹھا۔ بھائی کے کمرے سے باہر نکل کر کچھ دیر تک اسی جذب کے عالم میں ٹہلتے رہے۔ پھر تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئے۔

زریں گل بستر پر بیٹھی گھٹنوں میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھی وہ چند ثانیے تو اسی جذب کے عالم میں دروازے کے نزدیک کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے دروازہ بند کیا اور زریں کی طرف پلٹتے ہوئے بولے۔

"بہت زیادہ گریہ وزاری دوسرے کو شک و شبہات میں بھی مبتلا کر دیتی ہے زریں گل لیکن میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا ماسوا اس کے کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ جس نے آج بھری محفل میں میری عزت کو خاک میں ملا دیا۔" لہجے میں تندی ہی نہیں طنز بھی تھا۔

"لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ سچ ہو سکتا ہے۔"

زریں نے روتے روتے بھاری سی آواز میں الٹا ان سے سوال کیا۔

"اگر یقین ہی ہوتا تو پھر میں تم سے کیوں پوچھتا۔" زریں گل کی اشک چھلکاتی آنکھوں نے ان کے غصے پر ٹھنڈے چھینٹے سے مار دیئے۔

"پوچھنا ہی تو دراصل آپ کی عدم اعتمادی کی علامت ہے ملک فواد! اعتماد و یقین کی پختگی شک و شبہات کو دل کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔" زریں گل گلہ آمیز سے لہجے میں بولی۔

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔ تم ٹالنا چاہ رہی ہو تو اور بات ہے ورنہ میں نے تو تم سے اس بات کی صداقت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اب دیکھو نا جو بات عزت پر بنا دے اس کے بارے میں تحقیق تو کرنی ہی پڑتی ہے اور میں ویسے بھی تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"لیکن میں نے تو اپنا آپ آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ میں نے تو سب کچھ آپ کو بتا دیا تھا۔ کوئی ایک بات بھی نہیں چھپائی تھی۔" زریں گل گلوگیر لہجے میں بولی۔

"ہاں یہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور میں تو اب بھی تمہاری ذات پر اندھا یقین رکھتا ہوں۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا ایک مدلل جواب مجھے کبھی تو دوسروں کو دینا ہے۔"

"مگر یہ بالکل جھوٹ ہے۔ سراسر بہتان ہے ملک فواد۔ یقین جانیے اگر کوئی ایسی بات بھی ہوتی تو میں اسی روز آپ کو صاف بتا دیتی جس روز میں نے آپ کے سامنے اپنے ماضی کو عریاں کیا تھا۔" زریں گل تڑپ کر بولی۔ مگر وہ خاموش کھڑے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

"آپ کو یاد ہو شاید۔ اسی انجام کو ذہن میں رکھ کر ہی میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ خود کو میرا پابند نہ کریں اور اسی وجہ سے میں نے خود کو آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ تک بتا دیا تھا کہ میں بکاؤ مال کی طرح ہوں۔ ماں نے اپنے سر سے میرا بوجھ اتارنے کی غرض سے اور پیسے کے لالچ میں مجھے ایک بوڑھے بردہ فروش کے ہاتھ پانچ ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا پھر وہ بڈھا زبردستی مجھے شہر لے آیا اور ایک بوڑھی طوائف کے ہاتھ مجھے دس ہزار روپے میں فروخت کر دیا اور پھر طوائف نے میری آبرو کی قیمت دو لاکھ روپے وصول کی اور کیا میں نے اس وقت آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ کہیں میرا ہاتھ تھام کر آپ کو زندگی بھر پچھتانا نہ پڑے مگر آپ نے اپنے جذباتی فیصلے کے آگے میری ایک نہ سنی۔ لیکن دیکھ لیجیے۔ اب چند ماہ میں ہی وہی نوبت آ گئی جس کی میں شروع ہی سے متوقع تھی۔" زریں گل اپنی بات کہہ کر پھر رونے لگی۔

"نہیں میرے خیال میں تو تم خود ہی عدم اعتماد کا شکار ہو گئی ہو۔ کیونکہ جب مرد شوہر بن جاتا ہے تو اس کی حیثیت ایک حاکم کی سی ہو جاتی ہے اور کوئی حاکم اپنے کسی معتوب ماتحت سے اس کی تقصیر کی وجہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا بس کاغذ پر ایک کراس بناتا ہے اور ماتحت کو برطرف کر دیتا ہے لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو صرف تم سے ساری تفصیل پوچھنا چاہ رہا تھا۔" وہ زریں گل کی خوب صورت آنکھوں سے چھلکتے بے بسی کے آنسوؤں کو دیکھ کر ایک دم ہی موم ہو گئے۔

"میں تفصیل کیونکر بتاؤں جبکہ اس عورت نے میرے سامنے کچھ کہا ہی نہیں۔" زریں گل سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔

"مگر کیا تم اس عورت سے واقف ہو جس نے یہ آگ لگائی ہے کیونکہ اب میں بھائی جان ہی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ وہ تو اس عورت کا نام بھی لے رہی تھیں یعنی انہوں نے یہ سب اپنے دل سے نہیں گھڑا۔"

"ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن یقین جانیں میں اس عورت سے بالکل واقف نہیں البتہ جب نسرین بھابی نے اس عورت سے میرا تعارف کرایا تھا تو وہ مجھے دیکھی دیکھی ضرور لگی تھی۔ زریں گل نے یقین دلانے کے سے انداز میں کہا۔

"ہوں!" ان کی بات پر فواد کچھ سوچنے لگے پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔

"وہ یقیناً" تمہارے محلے میں ہی کہیں رہتی ہو گی۔"

"نہیں ہمارے محلے کے ایک ایک فرد سے ہماری شناسائی تھی۔ بالکل رشتے داروں کی طرح تھے ہمارے ہمسائے۔ میں نے تو اپنے محلے کے کسی گھر میں اسے رہتے نہیں دیکھا۔" اپنی بات کہنے کے دوران زریں اپنے دماغ پر زور ڈالتی رہی کہ شاید کچھ یاد آ جائے کہ اس عورت کو کہاں دیکھا تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد بھی وہ برابر یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

"جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے 'یہ پروین ضرور امی کی کوئی ملنے والی ہو گی۔ امی نے ہی اس کے سامنے میرے خلاف زہر اگلا ہو گا۔ انہوں نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی غرض سے مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا ہو گا۔ لیکن خیر کیا سچ ہے کیا جھوٹ میں اب بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ آپ میرے شہر کے محلے والوں سے اس کی تحقیق ضرور کرا لیں۔"

"نہیں نہیں تحقیق و حقیق کیسی 'تم نے تو بات ہی اتنی پتے کی کہی ہے کہ میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے۔ یقیناً" تمہاری سوتیلی ماں نے ہی اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے تم پر یہ الٹی سیدھی تہمتیں لگائی ہوں گی' میں تو اس صفائی ستھرائی کا بھی قائل نہیں تھا۔ یعنی اگر یہ بات غلط نہ بھی ہوتی تو بھی میں یہی کہتا کہ تم بالکل پاک صاف اور محترم ہو۔ میری دل و جان کی مالک ہو۔ وہ تو بھائی جان اور بھابی جان کی زہر افشانی اور آتش بیانی نے میرے خیالات کو پراگندہ کر دیا تھا جو میں نے تم سے اتنا بھی پوچھ لیا۔" پھر انہوں نے زریں گل کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر انہیں اپنے سینے سے لگا لیا اور شوہر کی ہمدردی اور محبت پا کر زریں گل بلک پڑی۔

"میں ــ میں نے صرف آپ کی خاطر اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کی تھی فواد اور آپ ہی کی خاطر جی رہی ہوں۔ خدارا آپ لوگوں کے بھڑکانے میں بالکل نہ آیا کیجیے ۔ کیونکہ آپ نے اگر لوگوں کے کہنے میں آ کر زریں گل کو دھتکار دیا تو زریں گل زندہ رہنے کا مفہوم بھول جائے گی فواد۔"

"اوہ ــ نو ــ نو زندہ رہنے کا شعور تو فواد نے تم سے ہی سیکھا ہے جاناں۔ ورنہ اس سے پہلے تو فواد زندگی کو ایک بوجھ ایک عذاب ہی سمجھتا رہا تھا تمہارے بغیر تو فواد ادھورا اور ناکارہ ہے۔ تم خدانخواستہ اس کی زندگی سے نکل گئیں تو فواد بن آئی ہی مر جائے گا۔" اور ان کی بات پر زریں گل نے تڑپ کر ان کے منہ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔

"اف۔ توبہ توبہ! کیسی بدشگونی کی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔" اور فواد اس کی اس حرکت پر زور زور سے ہنسنے لگے۔ "اف آہستہ ہنسئے اگر کسی نے سن لیا تو پھر شامت ہی آ جائے گی۔" زریں گل نے انہیں فوراً" ٹوکا۔

"نہیں اب شامت آنے کا وقت گزر چکا ہے زریں گل! آج میری بھائی جان سے کھل کر بات ہو گئی ہے اور آج ہی انہیں یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جب اولاد یا بہن بھائی برابر کے لگنے لگتے ہیں تو ان سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ اب وہ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ ویسے بھی اب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کسی قیمت پر بھی یہاں نہیں رہوں گا۔ ایک دن کے لیے بھی نہیں کیونکہ ان لوگوں کی تم سے بدسلوکی اور اہانت اب میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔" وہ زریں گل کے ریشمی بالوں پر اپنا رخسار ٹکا کر کہتے رہے۔

"لیکن ہم یہ گھر چھوڑ کر آخر کہاں جائیں گے۔ ہمارا تو کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں ہے۔" زریں گل سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی متفکر سے انداز میں بولی اور وہ ان کی طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائے اور پھر انہوں نے گمبھیر سے لہجے میں کہا۔

"جب موسم تبدیل ہونے لگتا ہے تو شاید تم نے غور کیا ہو کہ پرندے ناموافق آب و ہوا کی وجہ سے اپنے آشیانے چھوڑ کر ان ممالک کا رخ کرتے ہیں جہاں کا موسم انہیں راس آ جائے اور پھر وہیں از سر نو اپنے اپنے آشیانے تعمیر کرتے ہیں۔ جبکہ انسان کو تو خدا نے عقل دی ہے اور دو ہاتھ اور دو پاؤں بھی دیئے ہیں اور سوجھ بوجھ کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔"

”وہ تو ٹھیک ہے مگر نا ہوت میں سوجھ بوجھ اور عقل بھی ناکارہ ہو جاتی ہے اور ہم چرند پرند نہیں بلکہ انسان ہیں جو تنکوں اور گھاس پھونس کا نہیں گارے اور سیمنٹ کا آشیانہ بناتا ہے اور گارا اور سیمنٹ حاصل کرنے کے لیے اسے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے‘ زریں گل ان کی فلسفیانہ سی گفتگو پر قدرے چڑ کر بولی۔

”تو گویا سارا زور پیسے پر ہوا نا؟“ انہوں نے ہنس کر کہا۔ اور پھر یک لخت سنجیدہ ہو کر بولے۔

”مگر اس ذلت اور خواری کی زندگی سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم کسی فٹ پاتھ پر جا رہیں۔ آخر ظلم اور زیادتی کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے۔ میری برداشت تو اب جواب دے چکی ہے اور پھر تمہارا اب اس گھر میں رہنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ کم از کم میری غیرت تو گوارا نہیں کرتی ویسے بھی ہم لوگ سدا بھائی کے در پر تو نہیں پڑے رہیں گے۔ ہمیں اپنا حال اور اپنا مستقبل بھی تو سنوارنا ہے اور وہ اسی صورت میں سنور سکتا ہے جب ہم قطعی طور پر اپنے اختیارات استعمال کریں گے۔ یعنی انڈیپنڈنٹ ہو جائیں گے۔“ زریں گل جو دل سے یہی چاہتی تھی کہ وہ اپنا کہیں اور ٹھکانا کریں۔ اس نے بھی دل ہی دل میں میاں کی بات کی تائید کرتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا۔

”میرا کیا ہے‘ مجھے آپ سڑک پر بھی بٹھا دیں گے تو بیٹھ جاؤں گی کہ آپ کی رفاقت اور پیار ہی میرے لیے سب کچھ ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان روپوں اور زیورات کو آپ اس آڑے وقت میں کام میں لے آتے۔ آخر آپ اور میں الگ تو نہیں ہیں۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ برے سے برے وقت میں بھی اپنے ان روپوں کو میرے اور اپنے درمیان نہ لانا۔“ فواد بڑی ناگواری سے بولے۔

”نہ معلوم آپ ان روپوں کو کیا سمجھ رہے ہیں۔ جبکہ یہ میرا حق ہے میرا اپنا پیسہ ہے فواد! یہ دو لاکھ کی رقم بمعہ ان زیورات میری مرحومہ ماں نے میرے ماموں کے پاس رکھوائی تھی کہ جب میں بالغ اور باشعور ہو جاؤں تو وہ اس پیسے کو میرے حوالے کر دیں اور ماموں نے مرتے وقت یہ میری امانت مجھے سونپ دی تھی۔ خدا کی قسم اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری سوتیلی ماں مجھے ایک بردہ فروش کے ہاتھ محض پیسے کے لالچ میں فروخت کر رہی ہیں تو میں یہ ساری رقم اور زیورات ان کے قدموں میں ڈال دیتی اور یوں ٹھکانے سے بے ٹھکانا نہ ہوتی۔“ زریں گل نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”تم بہت غلط سمجھ رہی ہو زریں۔ میں تمہارا پیسہ اس لیے اپنے اوپر حرام سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے اسے استعمال کر لیا تو پھر میں زندگی بھر کے لیے نکما اور ناکارہ ہو جاؤں گا۔ میں خود اپنی محنت اور زور بازو سے اپنا مستقبل روشن بنانا چاہتا ہوں کیونکہ میں سیلف میڈ ہوں۔ سمجھ گئیں نا یعنی خود اپنے آپ کو بنانے والا۔“ آخری فقرہ انہوں نے اپنے مکے ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

”واہ عجیب منطق ہے آپ کی خیر چلیں اگر آپ خود کو کچھ بنانا بھی چاہتے ہیں تو یہ کیوں بھول گئے میری ذمہ داری بھی آپ پر ہے۔ آپ بلا پیسے کس طرح کچھ کر سکیں گے؟“ زریں گل نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر پرخیال انداز میں بولی۔

”اوہ ہاں۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بھائی جان سے کہہ کر اپنا حصہ الگ کروالیں۔ آخر اس جائیداد میں آپ آدھے کے شریک بھی تو ہیں اور پھر آپ کا حق بھی بنتا ہے۔“

”اصل میں اسی مسئلے نے ہمارے لیے اتنی مشکلات کھڑی کر رکھی ہیں۔ بھابھی جان شروع سے یہی تو چاہتی آ رہی ہیں کہ کسی طور پر یا تو میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں یا پھر اپنے حصے سے دستبردار ہو جاؤں۔ وہ یا بھائی جان بھلا میرے جائیداد کے مطالبے کو قبول کر لیں گے۔ الٹا ایسا دھماکا ہوگا کہ جس میں میرا تمہارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔“ فواد نے کہا۔

”وہ تو ہونا یقینی ہے لیکن کم از کم اس طرح بھائی جان کے خیالات اور نیت کا بھی علم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ آپ ان سے یہ سب کہنے کی اپنے میں ہمت پیدا کریں اور پھر آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔ مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی ان کے نہ ماننے کی۔“ زریں گل نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”ہونہہ اگر ان کے اندر ایک ذرا سا بھی انصاف کا مادہ ہوتا تو پھر آج ہم یوں ان کی اہانت اور تحقیر کا نشانہ نہ بنتے۔ بہرحال تم نے مجھے ایک بہت اچھی راہ دکھائی ہے۔ میں اس مسئلے پر بھائی جان سے ضرور بات کروں گا۔“ فواد نے زریں گل کے مشورے کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے کہا اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔

”لیکن آج تم اپنا اور میرا سامان ضرور باندھ لو کیونکہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ جائیداد سے میرا حق ملے یا نہ ملے میں تو بس تہیہ کر چکا ہوں کہ اب یہاں کسی قیمت پر نہ رہوں گا۔“ اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”میں تو آپ اسی وقت بھائی جان سے بات کرنے جا رہے ہیں۔“ زریں گل نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”نہیں‘ میں تو لباس تبدیل کر کے لیٹنے کی سوچ رہا ہوں۔ سارے دن کی کوفت اور پریشانی نے مجھے بری طرح تھکا دیا ہے اور بھائی جان سے تو میں پھر کبھی بات کروں گا۔ پہلے کل صبح پرویز بھائی کے پاس جاؤں گا۔ شاید وہ ہمیں کوٹھڑی یا کمرہ کرائے پر دلوا دیں۔“ فواد نے جواب میں بتایا اور پھر لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔

مگر انسان سوچتا کچھ ہے۔ اور ہوتا کچھ ہے فواد ابھی ڈھنگ سے لباس بھی تبدیل نہیں کرنے پائے تھے کہ آگے آگے ناصرہ بیگم اور ان کے پیچھے ملک جواد دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور زریں جو ابھی تک بستر ہی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی انہیں یوں بلائے ناگہانی کی طرح کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر جلدی سے دوپٹہ سر پر اوڑھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جواد صاحب نے بڑھ کر اس سے کہا۔

”آج کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں میرے گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہو اور میں ایک منٹ بھی تمہاری یہاں موجودگی گوارا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں غلام علی اور فتح علی کو بلوا کر تمہیں بہت بے عزت کر کے گھر سے نکالوں گا۔“ غلام علی اور فتح علی ناصرہ بیگم کے آوارہ اور بدمعاش بھائی تھے زریں تو ان کی اس دھمکی پر پیلی ہی پڑ گئی مگر فواد جو کونے میں کھڑے کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ کرتے کو گلے میں ڈال کر ان کی طرف آتے ہوئے بولے۔

”نہیں‘ کسی کو بلانے چلانے کی ضرورت نہیں بھائی جان! ہم خود بھی یہی فیصلہ کر چکے ہیں کہ اب ایک دن بھی یہاں نہیں رہیں گے مگر۔۔۔“

”اے شکر الحمدللہ کچھ تو غیرت جاگی تمہاری۔“ ناصرہ بیگم تمسخر سے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر بولیں۔

”جی ہاں‘ آپ کی نوازش سے ہی جاگی ہے لیکن میں صرف ایک شرط پر یہاں سے جاؤں گا۔“

”کون سی شرط؟“ ناصرہ بیگم نے چمک کر پوچھا۔

”لاحول ولا۔ پھر تم بیچ میں بولیں۔“ جواد صاحب نے بیوی کو فوراً ٹوکا اور پھر ان کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”ہاں تو بے کیا شرطیں ورطیں لگا رہا ہے۔“

”شرطیں تو نہیں فی الحال تو صرف ایک شرط ہی لگا رہا ہوں۔“ فواد متانت سے بولے۔

”تو کسی طرح پھوٹ بھی چک!“ ناصرہ بیگم نے پھر دخل در معقولات کیا۔

”اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے‘ براہ کرم آپ بیچ میں نہ بولیں۔“ فواد نے غیر روادارانہ لہجے میں ان سے کہا۔

”تم چپکی نہیں ہو گی۔“ جواد صاحب نے حسب عادت وہی جملہ کہا جو وہ اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے۔ تو ناصرہ بیگم منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

”ہاں تو میری صرف ایک ہی شرط ہے شرافت سے یہاں سے جانے کی کہ آپ جائیداد میں سے میرا حصہ الگ کر دیں۔ ورنہ غلام علی اور فتح علی کی کیا حیثیت اگر ان کے باوا جان بھی قبر سے نکل کر مجھے ڈرانے دھمکانے آ جائیں تو میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔“

”اے اے لو‘ دیکھ رہے ہو ایک تو چوری اس پر

سے سینہ زوری۔ ایک تو اتنا ہاتھوں سے نکل گیا کہ بڑے بھائی پر آج ہاتھ اٹھایا۔ اس پر اب میرے مرے ہوئے باپ کا نام لے رہا ہے۔ موا صورت حرام کہیں کا۔ اے کون سی ایسی لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے تمہارے باوا جان جو اب اس کا حصہ بخرا بھی ہو گا۔ یہ تو جو کچھ بھی ان کے پاس ہے سب ان کی اپنی محنت کا ہے' لو اور پالو اسے۔ کھلاؤ پلاؤ۔ پڑھواؤ اور خیال رکھو۔ دے دیا نا اس نے موت کا چلو تمہارے ہاتھ میں۔ ارے اس کے تو خون میں ہی غداری بسی ہوئی ہے موا نطف حرام۔"

"اپنی زبان کو لگام دیجیے بھابھی جان۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے اگر میں نے بھی جواب میں کچھ کہہ دیا تو آپ کی کیا رہ جائے گی۔" فواد ان کی گالی برداشت نہ کر سکے تو پوری قوت سے دہاڑے۔

"اے لو دیکھ رہے ہو ملک صاحب! یہ بدذات کیا کہہ رہا ہے۔" ناصرہ بیگم نے جان کر جواد صاحب کو بھڑکانا چاہا۔

"یہ تو جو کچھ بھی کہہ رہا ہے اس کا میں اسے ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یہ یاد رکھے گا۔ لیکن پہلے مجھے اس سے بات تو کرنے دو۔" بیوی کے بار بار دخل دینے پر شاید جواد صاحب بھی بیزار ہو گئے تھے۔

"ہاں تو بے کیا تڑی دے رہا تھا مجھے اپنی طرم خانی کی؟" انہوں نے اپنی بات ختم کر کے فواد کو مخاطب کیا۔

"تڑی میں آپ کو نہیں بلکہ آپ مجھے دے رہے تھے وہ ماشاء اللہ بھابھی جان کے بہت ہی شریف النفس اور عزت دار بھائیوں کی ورنہ میں تو صرف آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس جائیداد میں جس پر آپ قابض ہوئے بیٹھے ہیں۔ میرا بھی برابر کا حصہ ہے اور جس طرح آپ ٹھاٹھ سے اس گھر میں رہ رہے ہیں اسی طرح مجھے بھی اس گھر میں رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے میں ان دونوں کو بڑی آسانی سے حوالات میں بند کرا سکتا ہوں اور ان کے مچلکے تو اب کرا کے ہی رہوں گا۔"

اف یہ فواد کہہ رہا تھا؟ وہ بھائی بول رہا تھا جس کی جواد صاحب کی نظروں میں کوئی وقعت تھی نہ اہمیت۔ اور جسے وہ بہت بے زبان' بے پتا اور زر خرید ہی سمجھتے تھے۔ وہ قانون کو ہاتھ میں لے کر ایسی عاقلانہ اور مدلل گفتگو کر رہا تھا کہ وہ چکرا کر رہ گئے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لعنت ملامت پر اتر آئے۔

"اچھا تو میں بھی دیکھ لوں گا کہ تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے نمک حرام۔ کیا میں نے تجھے اسی لیے پالا تھا۔ اسی غرض سے تعلیم دلوائی تھی کہ تو بڑا ہو کر مجھ پر غرائے۔ مجھے دھمکیاں دے اور ہاتھ اٹھائے؟"

"اس طرح پالنے سے تو بہتر تھا آپ میرا گلا گھونٹ کر میرا قصہ ہی تمام کر دیتے بھائی جان۔ تاکہ کم از کم اس ذلت اور تحقیر سے' ان ایذاؤں سے جو آپ کی اہلیہ صاحبہ نے مجھے پہنچائی ہیں میں بچ تو جاتا۔" فواد نے دل گیر سے لہجے میں کہا۔ تو بری طرح پیچ و تاب کھاتی ناصرہ بیگم سے پھر خاموش نہ رہا گیا۔

"دیکھا ملک صاحب! میں نہ کہتی تھی کہ یہ آپ کے لیے ٹھٹھرا ہوا سانپ ثابت ہو گا کہ جیسے ہی گرمی پہنچے گی آپ کو ڈس لے گا۔ ہونہہ بڑا آیا جائیداد کا حقدار بن کر۔ ایک روپلی کا کھوکھا کھولا تھا آپ کے باوا نے تو آپ ہی نے دن رات محنت کر کے اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے یہ دوکان اور جائیداد بڑھائی ہے بھلا اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اس پر حق جتانے کی مجھے معلوم ہے یہ ساری باتیں یہ میرے تیمور کے حسد جلن میں کر رہا ہے۔ جب ہی تو سگا چچا ہو کر اس معصوم بچے سے ایسا خار کھاتا ہے کہ پیار کرنا تو کجا سیدھے منہ اس سے بات تک نہیں کرتا۔"

"میں اسے پیار نہیں کرتا یا آپ نے اسے ایسی تربیت دی ہے کہ وہ مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے ابھی سے مجھ سے سخت نفرت کرنے لگا ہے کیونکہ آپ اس کے سامنے مجھے ذلیل و خوار کرتی ہیں حتی کہ مار تک لیتی ہیں اور اس سے یہی کہتی ہیں کہ یہ تمہارا چچا نہیں دشمن ہے اس سے بچ کر رہا کرو۔ ورنہ یہ کسی دن تمہارا گلا کاٹ دے گا۔" فواد اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔ اور ان کی بات پر جواد صاحب نے بیوی کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا تو وہ اپنے کرتوتوں پر پردہ



ڈالنے کی غرض سے جلدی سے بولیں۔

"اے جب تیری یہاں ذلت بھی ہوتی ہے۔ تجھے سب اپنا دشمن بھی سمجھتے ہیں تو پھر تو یہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا۔ خیر میں تو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے اس فاحشہ کو اپنے یہاں مر کر بھی نہ رکھوں گی۔ اے ہاں یہ میرا گھر ہے۔ موا کوئی چکلہ نہیں ہے کہ کوٹھوں پر سے اتر کر بیسوائیں یہاں آئیں۔"

"اسے تو یہاں سے آپ کے یہ شوہر نامدار بھی نہیں نکال سکتے تو پھر آپ کی تو اوقات ہی کیا ہے اور مجھے معلوم ہے برادری بھر کے سامنے آپ نے یہ سارا فتنہ اسی لیے کھڑا کیا تھا کہ ہمیں رسوا کر کے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں لیکن میں اب یہاں سے نکلوں گا تو مر کر ہی نکلوں گا۔ جائیے جیسے پہلے ایک بار آپ نے اپنے مجرم بھائی کے ذریعہ پانی کی ٹنکی میں گروا کر مروانا چاہا تھا تو اب خود اپنے ہاتھوں سے ایسا کوئی زہر بھی تیار کر لیجے جو جلد از جلد ہم دونوں کا کام تمام کر دے۔" فواد اپنی قابل احترام بیوی کے بارے میں ایسے نامناسب اور نازیبا الفاظ سن کر اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے اور ناصرہ بیگم جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ جواد صاحب بولے۔

"بس اب کچھ کہنا بیکار ہی ہو گا کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ اسے یہاں سے نکالنے کا میں کوئی دوسرا ہی بندوبست کروں گا۔" اور پھر بیوی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئے۔

"ہونہہ کوئی اور بندوبست کروں گا۔ آنکھیں نہیں کھلی ہیں ان کی۔ جس دن ہوش آئے گا تو تڑپتے رہ جائیں گے۔" فواد آہستہ سے بڑبڑائے۔

"اصل میں تو یہ دونوں ایسے ہی سلوک کے مستحق تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے آج ان کا دماغ درست کر دیا۔" زریں گل جو ڈری سہمی اتنی دیر سے خاموش کھڑی تھی دونوں میاں بیوی کے جانے کے بعد سراہتے ہوئے انداز میں بولی اور پھر آہستہ سے فواد کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں جو اتنا ڈرپوک' بزدل' بے زبان اور بے پتا تھا تو یہ ایک دم ہی میرے اندر اتنی ہمت کیسے پیدا ہوئی۔ کیونکر مجھے اچانک ہی زبان مل گئی؟" فواد نے انہیں خود سے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے حالات کی وجہ سے۔" زریں گل نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں بلکہ تم نے۔ تمہاری طبیعت کے ٹھوس پن اور مستقل مزاجی نے ہی مجھے اتنا دلیر اور زبان دراز بنا دیا ہے۔ جس دن سے تم آئی ہو۔ میری زبان پر لگے قفل کھل گئے ہیں۔ تمہاری رفاقت نے میرے دل کی دم توڑتی امنگوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ تمہاری معیت نے مجھے خود اعتمادی اور حوصلہ مندی کی قوت بخشی ہے تمہاری گمبھیرتا نے مجھے احساسات کی شدت سے نوازا ہے جب ہی تو کچھ کہنے سے پہلے مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس بولنے پر آتا ہوں تو بولتا ہی چلا جاتا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری زبان تمہارے احساسات کی ترجمانی بن گئی ہو۔" تو زریں پیار سے ان کے شانے پر اپنا رخسار رگڑتی ہوئی بولی۔

"بس اب مجھے زیادہ نہ چڑھائیے۔ آیئے اب سوتے ہیں' آج واقعی ہم سکھ کی نیند سوئیں گے۔"

"سکھ کی نیند ہی نہیں سکھ چین کی بنسری بجائیں گے اب تو مگر دیکھی تم نے قدرت کی کرشمہ سازی کہ یا تو ہمیں ایک منٹ بھی یہاں رہنا گوارا نہ تھا یا آن کی آن میں ایسے حالات پیدا کر دیئے اب ساری عمر بھی یہاں دھرنا دے کر بیٹھے رہے کوئی ہمیں نہیں نکال سکتا۔" فواد نے بیچ میں کچھ توقف کر کے پھر کہا۔

"لیکن یہاں رہنے میں تو وہی ہر وقت کی بک بک جھک جھک ہی قائم رہے گی۔" زریں کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"نہیں اب اس کا امکان نہیں اور اگر ہو بھی تو پھر اب تم بھی ان سے پیچھے نہ رہنا۔" پھر کئی روز اتنے امن چین سے گزرے کہ شاید محلے والوں نے بھی سکھ کا سانس لیا ہو گا اور فواد تقریباً" روز ہی بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر کہتے۔

"دیکھا میرا بولنا کس قدر کام آیا۔ ورنہ اگر ڈر کے مارے گونگی ہڑپ کیے رہتا تو بھائی جان صاحب میرا حق کھا کر ڈکار بھی نہ لیتے۔" اور زریں مسکرا کر رہ جاتی۔ کیونکہ وہ اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی تھیں اور پھر وہ ناصرہ بیگم جیسی شاطر' چالاک اور لالچی عورت کا بڑا گہرا مطالعہ کر چکی تھی اور ان کی بچھو جیسی فطرت سے بھی واقف تھی اس لیے ان کی خاموشی سے بھی اسے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا اور اپنے اس خدشے کا اظہار وہ دبی زبان سے فواد کے سامنے بھی کر چکی تھی۔ مگر فواد ہمیشہ اس کی بات کو اس کے وہم پر محمول کرتے' لاپروائی میں اڑا دیتے تھے۔ پھر دو ڈھائی ماہ اسی طرح یعنی امن چین سے گزر گئے اور زریں گل کے خدشات باطل ہی ثابت ہوئے۔

فواد کا قاعدہ تھا کہ وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے تیار ہو کر کالج جانے کے لیے گھر سے نکلتے اور دوپہر ڈھائی بجے تک واپس آتے اور اپنا اور زریں کا کھانا بھی ساتھ ہی لاتے۔ کیونکہ ابھی گھر پر کھانا پکانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور وجہ وہی تاہوت تھی۔ بس کالج سے واپسی پر اگر اور کچھ نہ لے سکتے تو صرف دو نان ہی لے لیتے تھے پھر کھانا کھا کر ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ٹیوشنز پڑھانے چل دیتے اور اس کے بعد اپنی نوکری پر چلے جاتے تو واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی۔ کبھی پیدل آنا پڑتا تو رات کے آٹھ بھی بج جاتے۔

مگر اس روز تو وہ دن کو بھی نہیں آئے تھے۔ جبکہ خواہ کیسا ہی موسم ہوتا' کتنی ہی تھکن سوار ہوتی یا پیدل ہی چل کر آنا پڑتا۔ فواد دوپہر کو گھر میں ضرور آتے۔ مگر اس روز نہ دوپہر کو آئے تھے اور اب رات کے نو بج رہے تھے ان کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ زریں گل کی پریشانی دیدنی تھی۔ گھر میں تو سب بدخواہ ہی تھے کہ کسی سے اپنی پریشانی کا ذکر کرتی۔ ایک لے دے کے رکھی ہی تھی مگر وہ کئی ماہ سے اپنی بیٹی جیراں کی بات طے کرنے اپنے رشتے داروں کے پاس گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اب یہ کسے معلوم تھا کہ رکھی کو جان بوجھ کر ناصرہ بیگم نے نکالا ہے اور اس روز اتفاق سے جواد صاحب بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہ زمینوں کی آمدنی کا سالانہ حساب کرنے دو روز قبل ہی گئے تھے۔

زریں بار بار اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتی اسی امید پر کہ شاید داخلی دروازے سے میاں آتے نظر آجائیں مگر ہر بار اسے مایوس ہونا پڑتا۔ اسی وجہ سے وہ تنگ آکر کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی تھی کہ کوئی گیارہ بجے کے قریب دروازے کو زور زور سے پیٹا جانے لگا اور دھڑ دھڑانے کا یہ انداز اس کی جان پر بنا گیا۔ کہیں خدانہ کرے کوئی بری خبر نہ ہو۔ آخر یہ اس وقت کون آیا ہے۔ فواد کے کھٹکھٹانے کا یہ انداز تو نہیں۔ اس نے سہم کر دل میں سوچا۔ اس دوران دستک برابر جاری رہی مگر گھر میں سے کسی نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ تو زریں ان لوگوں کی بے حسی اور بداخلاقی کو روتی خود ہی اٹھ کر دروازے کے نزدیک آگئی لیکن احتیاطاً اسے کھولا نہیں بلکہ اس سے منہ لگا کر پوچھا۔

"کون صاحب ہیں؟"

"دروازہ کھولو بی بی۔ ہم ملک صاحب کو یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ ان کے بھائی کا ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ بڑی نازک حالت میں ہسپتال میں پڑے ہیں۔" اور اس خبر نے زریں کے حواس ہی معطل کر کے رکھ دیے جلدی سے دروازہ کھولا اور آڑ میں کھڑی ہو کر پوچھا۔

"کب ہوا ایکسیڈنٹ اور کہاں ہوا۔ خدارا ذرا تفصیل سے بتائیے۔"

"بی بی! یہ تو میرے کو ملوم نہیں۔ بس چھوٹا ملک جس کمپنی میں۔ پگار بانٹنے جاتا ہے۔ اسی کمپنی میں چوکیدار لگا ہوا ہوں اور ٹھیکیدار نے مجھے اطلاع دینے ملک صاحب کے پاس بھیجا ہے۔" وہ شخص جو خاصا معمر تھا' بڑی رسانیت سے بولا۔ زریں نے جھری میں جھانک کر دیکھا وہ تین آدمی تھے۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ بڑے ملک تو زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔ تین روز سے اب میں کہوں تو کس سے کہوں۔ ویسے ان کی حالت تو اطمینان بخش ہے؟" زریں ہراساں ہو کر بولی۔

"بس جی دعا کی ضرورت ہے کیونکہ زندگی تو خدا دینے والا ہے۔ پر گھر میں کوئی اور نہیں ہے؟" اس



شخص نے پوچھا۔

"ہاں نہیں کیوں نہیں مگر تم کہاں سے آئے ہو۔ کیا یہی وقت رہ گیا تھا یہاں آنے کا۔" زریں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھیں کہ دفعتاً پیچھے سے ناصرہ بیگم کی کراری آواز سنائی دی۔

"وہ۔۔۔ بھابھی جان یہ وہ فواد۔" زریں نے بتانا چاہا مگر ان کا گلا رندھ گیا اور وہ رونے لگیں۔

"ہونہہ۔ جس دن سے آئی ہو۔ ٹسوے ہی بہاتی نظر آتی ہو۔ مجھے تو وہم ہو گیا ہے تمہارے ہر وقت کے رونے دھونے سے۔ صاف صاف بتاؤ کہ بات کیا ہے آخر کوئی مر تو نہیں گیا جو تمہارے منہ سے بات نہیں نکل رہی۔" ناصرہ بیگم نے اپنے طنز بھرے لہجے میں حقارت سی شامل کر کے کہا تو زریں سہم کر بولی۔

"ان۔۔۔ نہیں، نہیں خدانہ کرے۔ ان کا صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔"

"ارے کن کا؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتی۔" ناصرہ بیگم چیختے ہوئے انداز میں بولیں۔

"چھوٹے ملک کا جی ملکانی جی۔" زریں کے بجائے ایک اور شخص نے بتایا۔

"اچھا۔ تو پھر تم کیوں آئے ہو؟"

"جی اطلاع دینے۔۔۔ جروری تھا نا۔" بڈھے نے کہا۔

"ہونہہ۔ جروری تھا نا۔۔۔ لے کے آگئے آدھی رات کو بے آرام کرنے۔ جاؤ۔ اپنا راستہ ناپو۔" اتنا کہہ کر ناصرہ بیگم نے دروازہ بند کر دیا تو زریں جو سخت ہراساں ہو رہی تھی لجاجت سے بولی۔

"بھابھی جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں فیضاں کو ساتھ لے کر چلی جاؤں آخر کسی کو تو ان کے پاس ہونا چاہیے۔"

"فیضاں کو ساتھ لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تو تو ارے غیروں کے ساتھ جانے کی عادی ہے۔ جا خود ہی چلی جا۔" ناصرہ بیگم ترخ کر بولیں۔ زریں شوہر کی طرف سے اس قدر ہراساں اور فکرمند ہو رہی تھی کہ فوراً جانے پر راضی ہو گئی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ اس وقت ان اجنبی مردوں کے ساتھ اس کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں نہ ان لوگوں سے ہسپتال کا پتا لے اور صبح سویرے ہی روانہ ہو جائے۔ اسی خیال سے اس نے جلدی سے دروازہ کھول کر کہا۔

"سنیں!"

"پھرما میں بی بی۔"

"آپ مجھے ہسپتال کا پتا اور ان کے کمرے کا نمبر بتا دیں۔ میں صبح خود چلی جاؤں گی۔ اچھا ٹھہریں' میں کاغذ اور قلم لے آتی ہوں۔"

اور اتنا کہہ کر جونہی زریں اپنے کمرے کی طرف پلٹی پیچھے سے اسے کسی نے اس بری طرح اپنے شکنجے میں جکڑا کہ وہ آواز بھی نہ نکال سکی کیونکہ کسی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا تھا اور بس وہ اپنی دہشت زدہ آنکھوں سے صرف اتنا دیکھ سکی کہ اس کی جیٹھانی وہاں سے کہیں غائب ہو گئیں۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور اسے ہوش نہ رہا۔

رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ جب فواد نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ مارا تو دروازہ خود بخود ہی کھل گیا۔ پورا گھر سناٹے اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا حتیٰ کہ ان کا کمرہ بھی۔

بھائی جان چلے گئے ہیں تو یہ سب لوگ کتنے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ اب اگر میرے بجائے کوئی چور اچکا ہوتا تو کتنے مزے سے گھر کا صفایا ہی کر جاتا۔" انہوں نے پلٹ کر دروازے کی کنڈی لگاتے ہوئے دل میں سوچا اور دبے پاؤں چلتے اپنے کمرے میں آگئے۔ "ہوں تو زریں واقعی بری طرح روٹھ گئی ہے۔ تبھی تو یوں بلیک آؤٹ کیے پڑی ہے مگر خیر جب میں اسے یہ بتاؤں گا کہ بلیک آؤٹ کرنے کے بجائے گھی کے چراغ جلاؤ کیونکہ تمہارے سر کا تاج صحیح سلامت واپس آگیا ہے اور وہ پورا واقعہ سنے گی تو اس کی ساری ناراضگی بھک سے اڑ جائے گی۔" پھر انہیں آج کا واقعہ یاد آگیا۔ وہ اپنے کالج سے نکل کر بازار میں کھڑے زریں کے لیے آم خرید رہے تھے۔ آموں کے پیسے انہوں نے دو روز تک کالج اور اپنی ٹیوشنز اور ملازمت پر پیدل آنے اور جانے کی صورت میں دو روز کا کرایہ جمع کر کے بچائے تھے کیونکہ زریں کو آم بہت مرغوب

تھے اور وہ ایک سیر لنگڑا آم خرید کر پلٹ ہی رہے تھے کہ دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے اور ان کے قریب آکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغاظات "گالیوں کا ملغوبہ بھی ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر اور بھی بہت سے لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے اور چونکہ فواد ان دونوں لڑکے کے بالکل قریب کھڑے تھے اس لیے چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔ اردگرد کھڑی بھیڑ اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھی کہ بھیڑ ہی میں سے ایک شخص نے بڑھ کر انہیں ایک بہت ہی غلیظ گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔

"ابے شرم نہیں آتی تجھے چپکا کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ تو بیچ بچاؤ نہیں کرا سکتا۔"

فواد نے بھلا یوں سرعام کسی کے منہ سے گالی کب سنی تھی۔ انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس شخص کے مارتے ہوئے کہا۔ "خبردار جو مجھے گالی دی۔ ایسا ہی تجھے شوق ہے تو تو خود بیچ بچاؤ کرا لے۔" مگر تھپڑ کھا کر تو وہ آدمی آگ بگولا ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کو پکار کر ان پر پل پڑا۔ فواد بھی جوابی کارروائی کرتے رہے مگر اس شخص کے دو ساتھی اور آ گئے اور ان تینوں نے مل کر فواد کو اتنا مارا کہ وہ بے دم سے ہو کر زمین پر گر پڑے۔ وہ تو دو پولیس والوں کے آنے کی وجہ سے وہ تینوں انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے ورنہ فواد کو وہ شاید جان سے ہی مار دیتے۔ اس اوہم پٹاخ میں آموں کی تھیلی بھی کہیں غائب ہو گئی تھی اور فواد کا سر اتنا چکرا رہا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔ تیورا کر زمین پر گرے تو سر پھٹ گیا اور اس کی وجہ سے ہوش بھی کھو بیٹھے۔

پھر نہ معلوم کون اللہ کا نیک بندہ انہیں ایک نزدیکی کلینک میں لے گیا اور ان کے ساتھ کیا ٹریٹ منٹ کیا گیا۔ جب ہوش آیا تو شام ہو رہی تھی اور سر "کہنی اور گھٹنے پر بینڈیج کی ہوئی تھی۔ انہوں نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح بیڈ سے اتر کر گھر چل دیں مگر دکھتے ہوئے سر نے اٹھنے کی اجازت ہی نہ دی۔ ویسے بھی جیب میں ایک دمڑی نہیں تھی اور پھوٹا ہوا گھٹنا لے کر پیدل جا نہیں سکتے تھے اور ادھر زریں کی پریشانی کا خیال انہیں بے کل کیے جا رہا تھا وہ چھپ کر نکل جانا چاہتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر انہیں کبھی اجازت نہ دے گا۔ لیکن ڈاکٹر نے اگر فیس اور علاج کے پیسے مانگے تو پھر وہ کہاں سے دیں گے۔ یہ فکر بھی انہیں کھائے جا رہی تھی آخر جب وارڈ بوائے رات کا کھانا لے کر آیا تو وہ نہ معلوم کیونکر اپنے دکھتے ہوئے سر کو تھام کر ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھے۔ جنرل وارڈ تھا اور اس کا غسل خانہ وارڈ سے کچھ فاصلے پر ایک کونے میں تھا۔ وارڈ بوائے خود ہی انہیں سہارا دے کر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی فواد نے دور دور تک سناٹا دیکھ کر موقع سے فائدہ اٹھایا اور سب کی نظروں سے بچتے بچاتے کلینک سے نکل آئے۔ آدھا راستہ تو پیدل ہی چل کے طے کیا تھا پھر گدھا گاڑی والا مل گیا جو غالباً "دھوبی تھا۔ اس کی منت سماجت کر کے تھوڑا فاصلہ گدھا گاڑی میں طے کیا اور باقی پیدل چل کر اور یوں انہیں گھر پہنچتے پہنچتے بارہ پونے بارہ بج گئے تھے وہ آہستہ آہستہ چلتے اپنے کمرے میں آئے تو بتی جلانے سے پہلے انہوں نے زریں کو آواز دے کر کہا۔

"زریں۔ زریں جان۔ اوہو تم تو بڑی سنجیدگی سے روٹھ گئیں۔ ورنہ ہمارے بغیر سو تو سکتیں ہی نہیں تم۔"

وہ اپنے سر اور گھٹنے کی تکلیف کو ہنسی میں دباتے ہوئے بولے اور پھر بٹن دبا دیا۔ تو کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔ مگر زریں بستر پر نظر نہ آئی۔ انہوں نے مسکرا کر سوچا کہ کہیں چھپ گئی ہو گی۔ مگر پورا کمرہ چھان مارا اور وہ ملی ہی نہیں انہوں نے پھر اسے زور زور سے آوازیں بھی دے ڈالیں۔ لیکن اگر زریں گھر میں موجود ہوتی تو ان کی پکار کا جواب بھی دیتی اور تب وہ کچھ کوفت اور کچھ جھنجھلاہٹ میں کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر زریں کو آواز دینے لگے مگر جواب پھر بھی نہ ملا۔ سارا گھر جیسے پڑا سو رہا تھا۔ پھر بھلا وہ کس سے پوچھتے۔

چپ چاپ خود ہی اسے سارے گھر میں ڈھونڈتے پھرے اور جب وہ کہیں نظر ہی نہ آئی تو سیدھے بھاوج





کے کمرے میں جا پہنچے جن کا کمرہ اندر کی طرف تھا اور جس کی بتی جل رہی تھی۔ وہ اندر پہنچے تو ناصرہ بیگم پانچ سالہ تیمور کو جو شاید سوتے سوتے جاگ گیا تھا" آہستہ آہستہ تھپکتی اپنے چھوٹے بھائی جسے انہوں نے اپنے اکیلے پن کی وجہ سے اپنے ہاں بلا کر رکھ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ فواد اچانک ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو کچھ ان کا حلیہ اور کچھ تیور دیکھ کر سہم سی اٹھیں۔

"زریں کہاں ہے بھابی جان؟" انہوں نے جاتے ہی پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم ہو گی یہیں کہیں۔" ناصرہ بیگم نے بہت ٹرا کر کہا مگر ان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"لیکن میں تو اسے سارے گھر میں ڈھونڈ آیا مجھے تو وہ ملی ہی نہیں۔" وہ ان کے جواب پر کچھ زیادہ ہی پریشان ہو کر بولے۔

"بس تو پھر صبر کر لو اس کی طرف سے۔ بھاگ گئی ہو گی اپنے کسی یار دھگڑے کے ساتھ۔" ناصرہ بیگم حقارت سے منہ بنا کر بولیں۔ مگر اپنی پریشانی میں انہوں نے بھاوج کے طنز پر کوئی توجہ نہیں دی اور ناصرہ کے بھائی سے پوچھا۔

"کیوں بے تو تو سارے گھر میں چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے کیا تو نے زریں کو نہیں دیکھا؟" تو احمد علی نے پہلے مسکرا کر بہن پر ایک نظر ڈالی پھر بولا۔

"اسے تو بھول جاؤ فواد بھیا۔ وہ تو ہو گئی ہے پھر۔"

"ابے کیا بکتا ہے بدذات۔ ٹھیک ٹھیک بتا ورنہ تیرا بھیجا پھاڑ دوں گا۔ سمجھا۔" فواد دانت پیس کر بولے۔

"ٹھیک ٹھیک کیا بتاؤں۔ کہہ تو دیا کہ وہ چلی گئی کسی کے ساتھ۔ یقین نہیں آتا تو باجی سے پوچھ لو۔" احمد علی دانت نکال کر بولا۔

"اے ہاں رنڈی ہی تھی نا آخر اگر چلی گئی تو تجھے کیوں تعجب ہو رہا ہے۔" ناصرہ بیگم بڑی نخوت سے بولیں اور ان کا خون کھول اٹھا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو بڑی بی۔ جلدی سے بتاؤ زریں کہاں ہے؟" وہ دانت کچکچا کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولے تو ناصرہ بیگم سہم کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور بھائی سے آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر باہر جانے لگا تو فواد اس پر جھپٹ پڑے اور اسے دھکے دے کر کونے میں پھینکتے ہوئے بولے۔

"خبردار جو تو نے یہاں سے جنبش بھی کی۔ ورنہ مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔" اور ابھی ان کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ ناصرہ بیگم جو اس اثناء میں اپنے تکیے کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکال چکی تھیں "ان کا نشانہ لیتی ہوئی بولیں۔

"بھرکس تو میں تیرا نکالوں گی بدبخت نابکار۔ ہونہہ بڑا ڈرانے دھمکانے آیا ہے 'مواجوانا مرگ۔"

اور پھر ناصرہ بیگم چاہتی ہی تھیں کہ ٹریگر دبائیں کہ فواد نے جھپٹ کر تیمور کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی آڑ لے کر بولے۔

"اگر تم نے گولی چلائی تو میں تیمور کو آگے کر دوں گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم پستول یہاں میرے پاس زمین پر پھینک دو۔"

اور ناصرہ بیگم جو ایسی کسی صورت حال کی بالکل متوقع نہیں تھیں اپنے لخت جگر کو دیور کی آڑ بنے دیکھ کر ایسی بوکھلائیں کہ فوراً" ہی ریوالور ان کے قدموں میں پھینک دیا جسے فوراً" ہی فواد نے جھک کر اٹھا لیا اور پھر اسے تیمور کی کنپٹی سے لگا کر بولے۔

"اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ زریں کو تم نے کہاں غائب کر دیا ہے۔ ورنہ تھوڑی ہی دیر میں پستول کی گولی تمہارے بیٹے کے پرخچے اڑا دے گی۔" اور اس دھمکی پر تو ناصرہ بیگم تھر تھر کانپنے لگیں۔

"بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔ وہ۔ وہ شیدے کے گھر میں ہے۔" اور پھر انہوں نے احمد علی سے کہا۔

"جا احمد علی۔ غلامے سے کہنا" زرین کو لے کر فوراً" یہاں آ جائے باجی بلا رہی ہیں۔"

"نہیں یہ کہیں نہیں جائے گا بڑی بی۔ میں تمہاری ان چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ ہاں اٹھ کر احمد علی! ادھر کھڑکی میں منہ ڈال کر بھائی کرم الٰہی کو آواز دے دے کہنا جلدی سے آؤ۔ چھوٹا ملک بلا رہا ہے۔" فواد نے فوراً" ہی بھاوج کی بات رد کر کے احمد علی سے کہا۔ احمد

علی بہت ہی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ بھاگ کر کھڑکی کے پاس آیا اور چیخ چیخ کر کرم الٰہی کو آوازیں دینے لگا' حالانکہ احمد علی سترہ اٹھارہ سال کا تھا۔ تھوڑے انتظار کے بعد کرم الٰہی نے کھڑکی کے قریب آکر پوچھا۔

"خیریت تو ہے کاکے تو مجھے کیوں بلا رہا ہے۔" اور تب فواد تیمور کو لیے لیے جو اچانک نیند میں خلل پڑ جانے اور دہشت زدہ ہو جانے سے زور زور سے رو رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس آکر بولے۔

"خیریت ہی نہیں ہے بھائی کرم الٰہی ۔۔۔ تم اتنی مہربانی کرو کہ احسان کو لے کر ذرا شیدے کے ہاں چلے جاؤ کیونکہ یہ ملکانی ہے نا اس کے بھائی تمہاری بھابی کو اغوا کر کے شیدے کے گھر لے گئے ہیں۔ جاؤ بھا چیتی کرو۔"

اور کرم الٰہی جو جالندھر میں بھی ان کا پڑوسی تھا اور بے حد نیک اطوار ہرانا شناسا تھا۔ زریں کے اغوا کی خبر سن کر سناٹے میں آگیا اور پھر یہ کہہ کر "اچھا ابھی لے کر آتا ہوں۔" فورا" ہی چلا گیا۔ پھر جب تک زریں نہ آئی اس وقت تک فواد پستول کو تیمور کی کنپٹی پر ٹکائے کھڑے رہے۔

کرم الٰہی اپنے بھائی احسان کی معیت میں زریں کو لے کر آیا تو پستول کو اپنی پتلون کی جیب میں رکھ کر فواد نے تیمور کو پچکار کر اس کے بیڈ پر لٹایا اور پھر زریں کا ہاتھ پکڑ کر جسے یہ یقین ہی نہ تھا کہ وہ بدمعاشوں کے چنگل سے نکل کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ سکے گی اور جس کے چہرے کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا تھا اور وہ بری طرح رو رہی تھی اپنے کمرے میں لے آئے کرم الٰہی بھی ان کے ساتھ ہی کمرے میں آگیا اور وہ اسے خود پر گزرنے والی روئیداد سنانے لگے۔

اس واقعے کے بعد تو بھائی بھاوج پر سے اعتبار ہی اٹھ چکا تھا اور سب سے بڑھ کر زریں کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا اس لیے دوسرے ہی دن وہ زریں کو لے کر اپنے پھوپھی زاد پرویز کے یہاں چلے آئے اور ان ہی کے ذریعہ ان کے ہی محلے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

اصل میں تو ان کے امتحان سر پر آگئے تھے۔ وہ تو وہ شہر بھی چھوڑ دیتے پھر پرویز ہی نے نہیں برادری کے بعض دوسرے لوگوں نے بھی انہیں کتنا اکسایا' کتنا سمجھایا کہ بھائی کے خلاف نادہی کارروائی کر کے جائیداد سے اپنا حصہ لے لیں مگر ان کا دل ہر شے سے برا ہو گیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے سننے کے باوجود کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کی۔

امتحانات ختم ہوئے تو وہ زریں کو لے کر ملتان آ گئے۔ آگے پڑھنے کا شوق ہی نہیں بلکہ پکا ارادہ تھا مگر حالات نے اجازت ہی نہ دی۔ اس لیے پڑھائی کا ارادہ ترک کر کے وہ فکر روزگار میں جت گئے۔

ایک روز ایک سرکاری ادارے میں درخواست گزاری کے لیے گئے تھے کہ وہیں ان کی ملاقات اپنے اسکول کے زمانے کے ایک دوست سے ہو گئی۔ اس نے چند ماہ پیشتر ہی ایک کنسٹرکشن کمپنی کھولی تھی۔ ان کے متعلق سنا کہ یہ ملازمت کے لیے سرگرداں ہیں تو انہیں بطور منیجر کے اپنی کمپنی میں ملازمت دے دی۔

ادھر زریں گل نے اپنے پیسے سے دستکاری کا ایک اسکول کھول لیا تھا اور یوں دونوں میاں بیوی کی خوب اچھی گزرنے لگی۔

اور پھر شادی کے پورے تین سال بعد ان کے یہاں اسماء پیدا ہوئی۔ اسماء ہو سوماہ پر گئی تھی۔

یادوں کے قافلے تھے کہ ماضی کی گرد سے نکل نکل کر فواد کی یادداشت کی سطح پر یکے بعد دیگرے اترتے ہی چلے آرہے تھے۔ یادیں بھی کیسی تلخ اور شرر ریز تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

زریں کا کہنا درست ہی ہے کہ ہم اسماء کو آخر کیا بتائیں۔ کن الفاظ میں تعارف کرائیں اپنے سگوں کا۔ جبکہ رشتے کی ڈور کا سرا تو ڈھونڈے نہیں مل رہا اور تعارف کرانا بھی ضروری ہے۔ انہیں اسماء کے آنے کا انتظار تھا لیکن خود ان کی زندگی ان کا انتظار نہ کر سکی۔

زریں گل جلد از جلد ان کے لیے سوپ کا پیالہ لے کر ان کے پاس آئیں تو وہ ان سے ملے بنا ہی سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ اور اسماء کو ان ساری باتوں میں سے کسی ایک کا بھی علم نہیں تھا۔ بس اسے



تو یہ معلوم تھا کہ بلکہ بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس کے کچھ سگے بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔

*-*-*

وہ پلکوں پر شبنمی موتی اٹکائے ۔۔۔ بھیگے بھیگے رخساروں کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں سیپارے لیے دیر سے آنے والی خواتین کو سپارے بانٹتی ہوئی جوں ہی داخلی دروازے پر آئی اس دراز قامت چوڑے چکلے تن و توش کے حامل بے حد ڈیشنگ سے اجنبی نوجوان کو جو عین دروازے کے بیچوں بیچ دہلیز پر کھڑا تھا دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر پیچھے مبادا کہ وہ فاتحہ میں شریک ہونے والی کسی خاتون کی جستجو میں آیا ہو مگر وہاں تو خصوصا" پردہ دار خواتین جو تعداد میں کچھ زیادہ ہی تھیں اسے دیکھ کر ڈسٹرب سی ہو گئی تھیں۔ کسی نے اپنی اجرک میں خود کو چھپا لیا تھا تو کوئی دوپٹے کا گھونگھٹ سا کاڑھ کر بیٹھ گئی تھی اور بعض ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گویا کسی سے بھی اس کا تھوڑا سا تعلق یا واسطہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جلدی سے پلٹ کر پھر نووارد کی طرف دیکھا۔

اف اشکوں سے جھلملاتی بڑی بڑی جھیلوں کی طرح ساکن سی نگاہیں۔

جن میں حیرت اور تجسس تھا اور۔

حسین ترکتابی چہرے پر سوگواری کے ساتھ ساتھ ایک حجاب آمیز تاثر بھی۔

خوب صورت فگر' سرو قد اور شہابی رنگت۔

کچھ دیر تو آنے والا پلک جھپکانا ہی بھول گیا۔

اور اس کے دیکھنے کے اس بے باکانہ سے انداز پر اس نے پلکیں جھکا کر پوچھنا چاہا۔

"آپ ۔۔۔ آپ ۔۔۔"

"جی مجھے تیمور جواد کہتے ہیں۔" وہ بدستور اسے ایک ٹک دیکھتا ہوا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ تو اس نے بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سخت الجھے کے عالم میں بولی۔

"تیمور جواد! کیا آپ آپ تایا جی کے ۔۔۔"

"ہاں جی قسمت' سے میں آپ کے تایا جی کا ہی فرزند ارجمند ہوں۔" اس نے پھر اس کی بات کاٹ کر جس طرح اس کا فقرہ پورا کیا اس کے سوگوار سے چہرے پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی جسے اس سے چھپانے کی غرض سے اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ تو پھر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ آیئے لاؤنج میں چل کر بیٹھیے جہاں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔"

"لیکن میں مردوں یا عورتوں کے پاس بیٹھنے تو نہیں آیا میں تو صرف مرحومہ چاچی کی تعزیت کرنے آیا ہوں گو بہت لیٹ کنڈولینس ہے مگر ۔۔۔"

"خیر ۔۔۔ خیر ۔۔۔ نیور مائنڈ ۔۔۔ سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں ۔۔۔ آپ آج ایک سال بعد ہی سہی لیکن آتو گئے نا ۔۔۔" اس نے اس کے انداز تکلم کا ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا بلکہ بڑی فراخدلی سے بولی۔

وہ ہنوز اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا اور وہ اسماء کے پیچھے ہال میں بیٹھی ہوئی خواتین کی نظروں کی زد میں بھی تھا۔ کچھ اس خیال سے بھی وہ بری طرح سٹپٹا رہی تھی اور کچھ خواتین کی بے پردگی کے خیال سے بھی۔

اور پھر کسی کو بھی تو معلوم نہ تھا کہ وہ اجنبی شخص کون ہے؟

"آیئے آپ چل کر تھوڑی دیر بیٹھیں تو سہی' آج امی جی کی برسی ہے نا بس قرآن خوانی کے فورا" ہی بعد فاتحہ ہو گی آپ اس میں تو شریک ہوں گے نا ۔۔۔"

"اوہ ہاں ۔۔۔ ضرور شریک ہوں گا مگر کہاں جا کر بیٹھنا ہو گا۔" اس نے عجیب از خود رفتہ سے انداز میں پوچھا تو وہ ایسی گڑبڑائی کہ سپارے ہاتھ میں لیے لیے جلدی سے اس کے پہلو سے نکل کر باہر آگئی اور تیزی سے بیرونی لاؤنج کی طرف بڑھتی چلی گئی جہاں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لاؤنج کے اندر کے بجائے اس نے دروازے پر ہی رک کر پیچھے دیکھا۔ وہ اس کے اس قدر قریب کھڑا ہوا تھا کہ وہ اگر احتیاط نہ برتتی تو یقینا" بری طرح اس سے ٹکرا جاتی۔

"آپ اندر چلے جایئے۔ میں ابھی ملازم کے ہاتھ آپ کے لیے چائے بھجواتی ہوں۔" تیز تر دھڑکنوں پر

قابو پانے کی کوشش میں اس نے کہا کہ ایسی صورت حال سے تو کبھی وہ دوچار ہی نہ ہوئی تھی۔

"لیکن میں اندر بیٹھنے والوں سے واقف ہی نہیں ہوں تو پھر وہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟ ویسے بھی میں تو آپ کو تعزیت دینے اور آپ سے ملنے کی غرض سے آیا ہوں۔" وہ وارفتہ سے انداز میں اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر بولا تو اس نے پیچھے سرک کر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ تو ٹھیک ہے لیکن.... لیکن اس وقت تو قرآن خوانی ہو رہی ہے نا... میرا مطلب ہے صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کا ہی تو معاملہ ہے۔ پلیز اتنی دیر آپ اندر جاکر بیٹھیں۔" تو جواب میں تیمور نے تھوڑا سا توقف کرکے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کوشش کروں گا کہ وہاں بیٹھ سکوں۔" اور پھر مزید کچھ کہے یا سنے بغیر تیزی سے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اور وہ اسے لاؤنج میں چھوڑ کر ہال میں واپس آئی تو اپنے فرسٹ کزن کی یوں آمد پر اپنا سارا رنج وملال بھول کر اتنی خوش خوش نظر آرہی تھی کہ اس کی سہیلی طیبہ نے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"بھئی، یہ آخر کون تھا اتنا ڈیشنگ سا جسے دیکھ کر تم اتنی خوش نظر آرہی ہو۔"

"وہ میرا فرسٹ کزن ملک تیمور جواد ہے اور میں آج پہلی بار اس سے ملی ہوں۔" اس نے طیبہ کی بات کا نوٹس لیے بغیر بتایا۔

"مگر تمہارا تو کوئی رشتے کنبے دار سرے سے ہے ہی نہیں پھر یہ ایک دم ہی اتنا اسمارٹ سا، پلا پلایا کزن کہاں سے پیدا ہو گیا۔" اسماء کے پڑوس میں رہنے والی ایک سہیلی نادیہ نے تمسخرانہ سے انداز میں پوچھا۔ اسماء اس کے طنز کو سمجھ تو گئی مگر برا مانے بغیر بولی۔

"نہیں۔ میرے تایا، تائی اور ان کے بچے سب ہی موجود ہیں اور یہ ملک تیمور تایا جی کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔"

"اے تو یہ تمہارے تایا، تائی اور ان کے بچے اب تک کہاں بس رہے تھے جو ان میں سے کوئی تمہارے ابو کے انتقال کے موقع پر آیا نہ امی کے۔"

ایک اور پڑوسن نے قدرے چٹختے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اسماء سٹ پٹا سی گئی۔ اب ان سے کیا کہتی کہ آپس میں میل جول بند تھا، اس لیے نہیں آئے تھے۔ وہ تو آنٹی صفیہ نے جواب اس کی سرپرست تھیں جلدی سے بات بنادی۔

"یہ لوگ تو عرصے سے افریقہ میں رہائش پذیر تھے پھر بھلا کیونکر آسکتے تھے اس وقت۔"

"جی ہاں یہ تو ابھی چند دن قبل ہی پاکستان آئے ہیں۔" آنٹی صفیہ کی بات سے اسے کچھ تو سند ملا تو وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔

"اے رفعت بہن! کیا آپ کو یاد نہیں اس کے تایا تو پچھلے سال یہاں آئے تھے۔" آنٹی صفیہ نے کہا۔

"خیر ہمیں اس سے کیا مگر تمہارے تایا زاد کو نہیں تو کم از کم تمہیں تو ہماری بے پردگی کا خیال رکھنا چاہیے تھا اسماء۔" ایک اور صاحبہ بولیں جو ایک قریبی محلے میں رہتی تھیں اور پردے کے سختی سے پابند تھیں۔

"آہو دی عجب بندہ ہے، جو منہ اٹھائے زنانیاں وچ وڑ آیا۔" ایک اور صاحبہ نے منہ بنا کر پہلی کی تائید کی۔

"جی آنٹی! میں آپ لوگوں سے سخت شرمندہ ہوں... اصل میں انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کدھر جانا ہے رفیقے نے انہیں بتایا ہی نہ ہو گا۔" سب کی ملامت سے گھبرا کر اسماء معذرتی لہجے میں بولی۔

"مگر اسماء! ان بیچارے نے تو کسی کی طرف دیکھا ہی نہیں پھر ان لوگوں کی بے پردگی کیسے ہو گئی۔" طیبہ نے اسماء کے معذرت کرنے پر قدرے چڑ کر کہا۔

"اے لو۔ دیکھا نہیں تو کیا ہوا، انسان کی نظر تو پڑ ہی جاتی ہے آپ ہی آپ۔" وہی پردہ نشین خاتون چمک کر بولیں۔ اور طیبہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ آنٹی صفیہ نے پوچھا۔

"اب کتنے سپارے اور باقی رہ گئے ہیں پڑھنے کے لیے۔"

"بس دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں آنٹی....۔" نادیہ نے جواب دیا۔

"تو لاؤ یہ دونوں سپارے میں پڑھ لیتی ہوں کیونکہ یہ سب تو ابھی پڑھ ہی رہی ہیں۔" اسماء بولی۔

"نہیں تم رہنے دو... یہ دونوں سپارے میں اور عائشہ ابھی پڑھ لیں گے۔ تم جاکر ذرا رفیقے سے یہ معلوم کراؤ کہ مردانے کا کیا حال ہے۔ کیا وہاں ختم پورا ہو چکا یا ابھی کچھ... باقی ہے۔" آنٹی صفیہ نے کہا اور اسماء کو ایسا محسوس ہوا کہ آنٹی صفیہ نے یہ کہہ کر اس کی کوئی دلی مراد پوری کردی ہو کیونکہ وہ خود بھی باہر جانا چاہ رہی تھی تاکہ رفیقے سے کہہ کر تیمور کو چائے بھجوائے۔

اس سے اس کا دل تو بہت چاہا کہ پہلے لاؤنج کا ہی رخ کرے مگر وہاں دوسرے مردوں کی موجودگی میں تاک جھانک کر یہ دیکھنا کہ اس کا کزن کیا کر رہا ہے۔ اسے بالکل مناسب نہ لگا، اس لیے وہ سیدھی اپنے گھر کے عقبی سمت آگئی جہاں کچھ زمین میں پتھروں سے بنائے گئے عارضی چولہوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور مرغن اور اعلیٰ قسم کے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو، بھوک اور پیٹ کے درمیان ایک جذباتی کھچاؤ سا پیدا کر رہی تھی۔ اور جہاں رفیقے کی موجودگی کے امکانات بہت یقینی تھے۔ کیونکہ وہ گھر کا پرانا اور واحد ملازم تھا اور کھانا پکانے سے لے کر سودا سلف لانے اور گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کے کاموں پر مامور تھا۔

مگر رفیقے اسے درمیان میں ہی مل گیا۔

تو وہ اسے مردانے میں جاکر ختم قرآن کے بارے میں پوچھ کر آنے کے ساتھ ساتھ نئے مہمان کے لیے چائے لے جانے کی ہدایت کرکے فوراً" ہی ہال میں واپس آگئی۔

"دیکھ آئیں اسے۔" طیبہ نے پھر چھیڑا۔

"فضول باتیں نہ کرو، میں تو ادھر گئی بھی نہیں۔" وہ چڑ کر بولی اور پھر آنٹی صفیہ کو مخاطب کرکے کہا۔

"آنٹی! میں نے رفیقے کو مردانے میں بھیج دیا ہے۔ فاتحہ تو مردانے میں ہی ہو گی نا۔"

"ہاں۔ اسی لیے تو بھجوایا ہے کہ ہم سب بھی اس وقت اگلے کمرے میں چلے جائیں گے۔" آنٹی صفیہ نے کہا... ان کے آگے ہی ایک تپائی پر وہ دونوں آخری پارے رکھے تھے جو اب تک پڑھے نہیں گئے تھے۔ اسماء نے بڑھ کر خود ہی ان میں سے ۲۹واں پارہ اٹھا لیا اور وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگی مگر ابھی دو تین صفحے ہی پڑھ سکی تھی کہ رفیقے نے ہال کے دروازے پر آکر اسے آواز دی تو وہ سپارہ تپائی پر رکھ کر دروازے پر پہنچی۔

"بی بی! ادھر مردانے میں تو قرآن شریف پڑھایا جا چکا ہے۔ اب قدیر صاحب نے بولا ہے کہ بیگم صفیہ اگر اجازت دیں تو فاتحہ پڑھ لی جائے۔"

"ان کو کل سے کہنا ابھی ادھر دو پارے اور باقی رہ گئے ہیں۔" اسماء نے کہا۔

"اچھا بی بی۔" رفیقے اتنا کہہ جانے لگا تو اس نے ذرا آگے بڑھ کر اسے پکارا۔

"اور رفیقے کاکا! سنو۔ کیا چھوٹے ملک کو چائے دے آئے۔"

"کون چھوٹا ملک؟" رفیقے نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

"ارے وہی جو ابھی دس پندرہ منٹ پہلے یہاں آئے تھے۔ کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا تھا... وہ تایا جی کے بڑے بیٹے۔"

"نہیں۔ میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی بی بی۔"

"تو اس کا مطلب ہے، تم چائے لے کر بھی نہیں گئے ان کے لیے۔" اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"نئی جی آپ حکم دیں اور میں نہ کروں... میں تو چائے لے کر گیا تھا ادھر پر مجھے تو وہاں کوئی بھی نئی صورت نظر نہیں آئی ہاں تبہ (البتہ) وہ قدیر صاحب کچھ کہہ تو رہے تھے کہ ایک بندہ آیا تھا بغیر کچھ پڑھے چلا بھی گیا۔" رفیقے نے کہا تو اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تو تیمور آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ مگر وہ کیوں آئے تھے آخر چھدا اتارنے یا مجھ پر احسان رکھنے کیا ضرورت تھی آنے کی۔ اب ان لوگوں کو معلوم ہو گا تو بھلا وہ کیا سوچیں گے کہ میرا تایا زاد آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ نہ معلوم کیا سمجھیں کہ میں نے خوامخواہ ایک

انجان اور اجنبی خوب صورت سے شخص کو اپنا کزن بنا کر پیش کر دیا۔ ان لوگوں کے ذہن تو پہلے ہی اتنے پست ہیں۔ اس نے سراسیمگی کے عالم میں دل میں سوچا۔ رفیقے چلا گیا تھا وہ پلٹ کر اندر آئی تو اس کی پڑوسن رفعت نے بڑے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"تو بھئی آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔"

اور اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ انہوں نے رفیقے کی چھپٹی چھپٹی آواز سن لی ہے۔

"نہیں کیا مطلب؟" ایک اور صاحبہ نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی وہ جوان کا تایا زاد آیا تھا ناں ابھی ابھی وہ جس طرح چپکے سے آیا تھا اسی طرح چپکے سے کھسک بھی گیا ہے۔" وہی خاتون بولیں جنہوں نے پردہ نشین خاتون کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"اے وہ تمہارا تایا زاد ہی تھا یا کوئی فراڈ۔ آج کل تو بڑا اندھیر مچا ہوا ہے۔ خوب صورت لڑکے طرح طرح کے فراڈ کر کے لوگوں کو دھوکا دے دیتے ہیں۔" ایک اور پڑوسن بیگم رضوان بولیں۔

"اب مجھے کیا خبر انہوں نے تو میرے تایا کا نام لے کر اپنا تعارف کرایا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ وہ میرا تایا زاد تھا یا کوئی فراڈ۔" اسماء نے ان سب کی رکیک باتوں پر جل کر بولی۔

"بھئی تایا زاد ہی ہو گا ورنہ یوں جوتوں سمیت تو کوئی آنکھوں میں گھسنے کی کوشش نہیں کرتا۔" آنٹی صفیہ نے اسماء کو محض ان خواتین کی بے جا قیاس آرائیوں سے بچانے کی غرض سے کہا۔ ورنہ دل میں وہ بھی یہی سوچ رہی تھیں کہ نووارد کوئی فراڈ ہی نہ ہو۔

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کوئی فراڈ ہی ہو اور اسماء کی کسی کمزوری سے واقف ہو۔" رفعت نے کہا جو پڑوسیوں کی کمزوریوں اور خامیوں کو ٹٹولنے کی عادی تھیں اور ان کی بات پر اس اتنی سوگوار محفل میں بھی ایک قہقہہ گونج اٹھا اور اسماء بیچاری کا منہ اتر کر رہ گیا۔

"بھئی تم ان فضول قیاس آرائیوں کی پروا کیوں کرتی ہو اسماء۔ وہ اگر کوئی فراڈ بھی تھا تو خود ہی آیا اور چلا بھی گیا۔ کوئی تم نے تو اسے نہیں بلایا یا بھگایا۔ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا دینا تو بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔" طیبہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کی اتری اتری سی شکل دیکھ کر دردمندی سے بولی۔ وہ بڑی چالاک تھی۔ براہ راست بڑوں کو مخاطب کر کے نہیں کہتی تھی بلکہ اسماء کو ذریعہ بنا کر کہتی تھی۔ اسی خیال سے اسماء کو بھی ہنسی آ گئی۔

اعتراضات کرنے والی خواتین کچھ تو طیبہ کی بات پر اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں کچھ صفیہ نے طیبہ کی تائید میں کہا۔

"ہمارے ساتھ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے بلکہ دوسروں کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ تک نہیں دیکھتے کہ درس کی محفل ہے، خوشی کی یا غمی کی۔ بس فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔ چلو بیٹی طیبہ! اسماء اور تم مل کر یہ دونوں پارے بھی جلدی سے ختم کر لو فاتحہ خوانی کے بعد پھر کھانے پینے کے جھنجھٹ سے بھی تو نمٹنا ہے۔" اور یوں پھر پوری محفل پر سناٹا چھا گیا اور جو خواتین ابھی تک سپارے پڑھ رہی تھیں وہ پھر سپاروں کی طرف متوجہ ہو گئیں لیکن صفیہ بیگم کو اب بھی ان کی ذہنیتوں پر کوفت ہو رہی تھی۔

"ہونہہ! خدا کا پاک کلام ہاتھ میں لے کر فضول باتیں کرنا۔۔۔"

"بہنو برا نہ مانیے گا یہ دنیا تو ہمارے اعمالوں کی کسوٹی ہے، یہاں پر اٹھنے والا ہر قدم گناہوں کی دلدل سے ہو کر گزرتا ہے۔ بس تھوڑی سی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دنیادار لوگ ہیں اور ہمیں ہر طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے قلوب کو صاف اور فراخ رکھیں اور خداوند قدوس کی خوشنودی کو مقدم تو بہت سے گناہوں سے بچ تو سکتے ہیں۔" صفیہ بیگم نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"اوہو! شاید آنٹی صفیہ کو ہمارا ہنسنا بہت ناگوار گزرا ہے۔" رفعت کی بیٹی نادیہ نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بیٹی! ہنسنا یا رونا تو غیر اختیاری عمل ہے۔



بھلا مجھے کیوں ناگوار گزرنے لگا البتہ کسی کی دل آزاری یا عیب جوئی ایسا قبیح فعل ہے کہ جس کی معافی اور تلافی ممکن ہی نہیں اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ کیا تم اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرو گے اور افسوس تو اس بات پر ہے کہ یہ عیب زیادہ تر خواتین میں ہی پایا جاتا ہے۔ خوشی کی یا غمی کی محفل ہو یا اللہ رسول کی خواتین عام طور پر دوسرے کی غیبت یا عیب جوئی میں ہی مصروف نظر آتی ہیں اس پر ستم یہ کہ ادھر پیٹھ مڑی اور ادھر برا بھلا کہنا شروع کر دیا یعنی کھلی منافقت ہوتی ہے یہ تو گویا دوہرا گناہ۔۔۔ توبہ توبہ خدا معاف کرے۔" صفیہ بیگم نے کچھ نرمی اور کچھ تلخی سے کہا۔

"ہاں! اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ دوسروں کو ایسی نصیحتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ ایسے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔" رفعت طنز کرتی ہوئی بولیں۔

"ہاں چونکہ انسان فرشتہ نہیں بلکہ غلطیوں اور خطاؤں کا پتلا ہوتا ہے ہزار احتیاطوں کے باوجود بھی اس سے بہت سی خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں لیکن رفعت بہن! اچھا نائب ہونے کی حیثیت سے خدا نے بندے کو یہ اختیار تو ضرور دیا ہے کہ وہ نیک اور بد میں تمیز کر سکے اور جس راہ کو چاہے اپنا لے اور میں کوشش تو یہی کرتی ہوں کہ نیک راہ پر چلتی رہوں اس کے باوجود بھی اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کو آپ ہی بخوبی محسوس کر سکتی ہیں کیونکہ انسان کو خود اپنی خامیاں تو کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔" صفیہ بیگم نے رفعت کو ایسا کھرا جواب دیا کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

"چلو خیر۔۔۔ صفیہ بہن نے تو بہشت میں زمرد کا محل کھڑا کر ہی لیا اپنے لیے۔" پردہ نشین خاتون نے اپنا سپارہ ختم کر کے اسے تپائی پر رکھتے ہوئے بہت ہنس کر کہا۔

"ارے بی بی! میں بہت ناچیز اور گناہ گار ہستی ہوں خدا کرے آپ کی دعائیں مستجاب ہو جائیں اور مجھے بہشت میں زمرد کا محل نہ سہی ایک چھوٹا سا گھاس پھونس کا جھونپڑا ہی نصیب ہو جائے۔" صفیہ بیگم دل گیر سے لہجے میں بولیں۔

"اصل میں تو آنٹی! لوگوں نے خوامخواہ ہی مذہب کو ہوا بنا کر رکھ دیا ہے۔ میرا مطلب ہے 'لوگ ہر بات میں مذہب کو بیچ میں لے آتے ہیں کہ یہ نہ کرو وہ نہ کرو' اس میں گناہ ہو گا۔ اس میں ثواب ہو گا جب کہ عملی زندگی سے مذہب کا اتنا گہرا تعلق بھی نہیں ہے کیونکہ حالات سے مجبور ہو کر زندگی بنانے اور سنوارنے کے لیے بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔" ایک لڑکی طاہرہ بولی جو بہت ایڈوانس تھی اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

"نہیں طاہرہ۔ ہمارا مذہب تو اس قدر سیدھا سادا اور آسان ہے جیسے کوئی سیدھا اور متوازی راستہ جس میں کوئی نشیب و فراز ہو نہ ٹیڑھ اور نہ کوئی موڑ توڑ۔۔۔ جو اپنی ہمواری کے ساتھ سیدھا منزل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔" صفیہ نے بہت دھیرے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر صرف ان کے لیے جو منزل تک پہنچنے کے شیدائی ہوں ورنہ وہ لوگ تو مذہب کو ہوا ہی سمجھتے ہیں جنہیں منزل تک پہنچنے کی جستجو نہیں ہوتی رہا عملی زندگی کا سوال تو ہماری زندگی کا تمام تر نظام ہمارے مذہب کے اعلیٰ وارفع اور آفاقی اصولوں اور ضابطوں پر ہی قائم ہے۔ یعنی ہمارا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، ہنسنا بولنا حتیٰ کہ سانس تک لینا بھی مذہب ہی سے وابستہ ہے۔ اب رہ گیا جائز یا ناجائز یا گناہ اور ثواب کا سوال تو میں تم کو صرف ایک نصیحت کروں گی کہ تم ہر بات اور ہر معاملے میں خدا کی خوشنودی اور خوف کو مقدم رکھو گی تو پھر تمہیں خود ہی اپنے اس سوال کو سمجھنے کا شعور آ جائے گا کہ زندگی بنانے اور سنوارنے کے لیے یا حالات سے مجبور ہو کر انسان کو بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو مذہبی نقطہ نظر سے صریحاً "ناجائز اور غیر مناسب ہوتے ہیں۔"

"اوہو! آنٹی صفیہ کو تو انڈسٹریل ہوم کی مالکہ نہیں کسی تدریسی مدرسہ کی مبلغہ ہونا چاہیے تھا۔" نادیہ نے استہزا طاہرہ کے کان میں کہا۔

اور تبھی رفیقے نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اطلاع دی۔

"اچھا جی، پر چھیتی کریں ادھر سب لوگ جلدی کر رہے ہیں۔" رفیقے نے کہا اور پھر چلا گیا۔ تو جن خواتین کے تھوڑے تھوڑے پارے باقی رہ گئے تھے وہ بھی جلدی جلدی پڑھنے لگیں۔۔۔ پھر تھوڑی دیر بعد قرآن پاک ختم کر کے ساری خواتین لاؤنج کے برابر والے کمرے میں چلی آئیں اور پھر فاتحہ خوانی کے بعد مردانے اور زنانے میں بیک وقت دستر خوان بچھوا دیئے گئے اور کھانے کے دوران بھی صفیہ بیگم، طیبہ اور اسماء نے دیکھا کہ ساری خواتین آپس میں کھسر پھسر کر رہی ہیں۔

اسماء ہی نہیں حنیفہ بیگم بھی صبح سے کام کرتے کرتے بری طرح تھک گئی تھیں۔ اس پر دوپہر کے تین بج چکے تھے اس لیے انہوں نے اسماء کو آرام کرنے کی ہدایت کی اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور غم سے نڈھال اور تھکن سے چور اسماء کو لیٹنے کے باوجود بھی چین نہیں آیا۔ اس کا الجھا ہوا دماغ بری طرح الجھتا ہی چلا گیا۔

اس کے ابو نے تو اسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ ساری زندگی چھپائے ہی رکھا اور جب ایک دن بہت چپکے سے اسے اور اس کی امی کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو کافی دنوں بعد جب اس کی امی کے پاس اس کے تایا کا تعزیتی اور معذرتی خط آیا تب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا بھی اس کے ابو اور امی کے علاوہ دنیا میں کوئی سگا موجود ہے اور تب ہی اس کی امی نے اسے بتایا تھا کہ چونکہ وہ غیر خاندان سے تھیں اس لیے ان کی جیٹھانی کا ان سے مزاج نہیں ملا تھا۔ لہٰذا آئے دن کی چخ چخ اور کل کل سے تنگ آ کر اس کے ابو نے یہی بہتر سمجھا کہ نگاہ بدلنے سے بہتر ہے کہ کوچہ ہی بدل دیں اور پھر الٹا گھر ہی نہیں شہر بھی چھوڑ کر ملتان جانے کا قصد کیا کہ ملتان میں انہیں روزگار ملنے کی امید تھی۔ تو بڑے بھائی نے جو نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلے جائیں۔ اس بات پر بڑی لے دے مچائی اور نتیجتاً" دونوں آپس میں ترک تعلق کر بیٹھے۔ اصل میں تو جیٹھانی بڑی دبنگ قسم کی خاتون تھیں۔ میاں کو انہوں نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔ انہیں کا سکہ سارے گھر میں چلتا تھا، میاں بھی ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ میں ان کی دیورانی تھی اور پھر غیر خاندانی اس لیے وہ ہمیشہ مجھ پر حاوی رہنے اور مجھے دبانے میں کوشاں رہتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تمہارے ابو نے اپنی پسند سے مجھ سے شادی کی تھی جب کہ جیٹھانی کی شروع سے یہ خواہش تھی کہ وہ تمہارے ابو کی اپنی بھانجی سے شادی کریں۔ بس اسی لیے تمہاری تائی ساری کسر مجھ سے نکالتی تھیں اور وہ تو مجھے، تمہارے ابو سے طلاق تک دلوانے کے درپے تھیں اور اسی وجہ سے میری جان کی لاگو ہو گئی تھیں اور ان کے خطرناک ارادوں کو بھانپ کر ہی تمہارے ابو قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور ان کا گھر چھوڑ کر یہاں ملتان آ گئے تھے۔ شروع شروع میں تو چند ماہ تک تمہارے ابو کو بیروزگاری کی وجہ سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر پھر ان کے ایک دیرینہ دوست نے انہیں اپنی اس کنسٹرکشن کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا تھا مگر وہ کمپنی بھی صرف تین سال تک ہی چل سکی تھی۔ پھر تمہارے ابو کی ملازمت چھوٹی تو وہ کافی عرصے تک بے روزگار رہے مگر بے روزگاری کے عالم میں بھی وہ خالی نہیں بیٹھے بلکہ واقف کاروں سے کہہ کر چند ٹیوشنز بھی لگا لیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی۔ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد کہیں جا کر انہیں اس کالج میں لیکچرار کی جگہ مل گئی۔ اس دوران میں ہمارے گھر کے سونے آنگن میں تم اپنے ننھے منے وجود کے ساتھ رونق بڑھانے آ چکی تھیں۔ تمہارے ابو کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ اس کے باوجود بھی ہم نے بڑے ناز و نعم سے تمہاری پرورش کی۔ تمہیں پڑھایا لکھایا اور تمہارے لیے یہ چھوٹا سا بنگلہ بھی بنوا دیا۔ اور اس طرح کہ حکومت کی طرف سے اساتذہ کو زمینیں الاٹ ہوئیں تو تمہارے ابو کو بھی یہ پلاٹ مل گیا تھا۔ بہرحال وہ تو جو ہونا تھا رفت گزشت لیکن یہ دیکھو تمہارے تایا ابو نے کیسا درد بھرا خط لکھا ہے اور

کس کس طریق پر اپنی زیادتیوں اور کوتاہیوں پر معذرت کی ہے۔"

تمام حقیقت سے آگاہ کرنے کے بعد زریں گل نے ملک جواد کا خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی آزردگی سے کہا۔

"میں کیا کروں گی اسے پڑھ کر۔۔۔ جب کہ ان کی شکل دیکھنی تو کجا ان کے بارے میں سنا بھی آج ہے۔" اسماء بیزاری سے بولی۔

"ہاں اس بات کا تو مجھے بھی سخت قلق ہے بیٹی! کہ اس روز جس دن تمہارے ابو رخت سفر باندھ رہے تھے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساری بات تم کو بتا دیں گے مگر افسوس کہ موت نے انہیں مہلت ہی نہیں دی ورنہ وہ تو کالج سے تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔" اپنی بات کہتے کہتے زریں گل کی آواز بھرا گئی۔

"ہونہہ! ابو بیچارے تو تھے ہی فطرتاً صاف اور فراخ دل لیکن اگر وہ مجھے بتا بھی دیتے تو فائدہ بھی کیا ہوتا امی جی! آپ جانتی ہیں کہ آپ نے تار کے ذریعے ابو کے انتقال کی اطلاع بھی بھیجی تھی اس کے باوجود بھی بڑے، بھائی صاحب نہیں پلٹے۔" اسماء چمک کر بولی۔

"ہاں مگر انہیں وہ تار ملا ہی نہیں تو پھر وہ کیونکر آتے۔ ہو سکتا ہے تار بھیجنے والے نے غلط پتا لکھوا دیا ہو۔" زریں گل نے کہا۔

"ہونہہ تار نہیں بھی ملا تھا تو کیا یہ ملک جواد صاحب صرف اسی انتظار میں تھے کہ ابو مریں تو یہ ہمیں تعزیت کا خط لکھیں۔ ایسے ہی اپنے کیے پر نادم ہیں تو ابو کی زندگی میں ہی ان سے ملنے کیوں نہ آ گئے۔" اسماء بے حد تلخ سے لہجے میں بولی۔

"نہیں، کوشش تو انہوں نے بہت کی تھی کہ تمہارے ابو کی زندگی میں تعلقات استوار کرنے کی لیکن تمہارے ابو نے ہی پسند نہیں کیا تھا۔ مگر اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کے خیالات بدل گئے تھے اور ان کی یہی خواہش تھی کہ کسی طرح بھائی کو اپنے پاس بلا لیں یا خود جا کر ان سے مل آئیں مگر بے چارے یہ آرزو دل کی دل میں ہی لیے رخصت ہو گئے۔" زریں گل نے بتایا تو اسماء چپ سی ہو گئی۔

"دیکھو بیٹی! وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے احساسات اور خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں کیونکہ وقت کی گردش، تجربات اور مشاہدات انسان کو کبھی نہ کبھی اس کی غلط کاریوں کا احساس ضرور دلا دیتے ہیں تب ہی تو تمہارے تایا اپنے کیے پر سخت نادم اور پریشان ہیں اور ندامت اور پچھتاوے کا احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو ضمیر کی خلش بن جاتا ہے اور ضمیر کی خلش انسان کے لیے کسی سزا سے کم نہیں ہوتی۔ بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے بھائی جان کو یہاں آنے کا حوصلہ نہ پڑا ہو، تب ہی تو انہوں نے ہمیں کس محبت سے اپنے پاس بلایا ہے۔" زریں گل بیٹی کو خاموش دیکھ کر پھر بولیں۔

"افوہ! آپ تو اپنی فطرت کی وجہ سے کہ آپ کا دل آئینے کی طرح صاف اور شفاف رہتا ہے۔ ان کی محبت کے دو بول پڑھ کر ساری رنجش ہی بھلا بیٹھیں امی جی۔ مگر کم از کم میرے لیے تو یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ میں ان کے یہاں جانے کا سوچوں۔" اسماء قدرے تنک کر بولی۔

"خیر ان کے یہاں جا کر رہنے کے حق میں تو میں بھی نہیں ہوں کہ اپنا گھر بھلا اور آپ بھلے۔۔۔ مگر اسماء ہمیں کم از کم اپنے دل تو صاف کر لینے چاہئیں کہ اب خاص طور پر تمہارا ان کے سوا اس دنیا میں رشتے دار ہی کون ہے میں چاہتی ہوں کہ ان کے اس خط کا جواب تم انہیں دو۔۔۔"

"میں انہیں جواب دوں، انہیں خط لکھوں۔۔۔ نہیں نہیں امی جی میں تو اس معاملے میں بالکل کوری ہوں کیونکہ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں نے آج تک کی پوری زندگی میں کبھی کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔ بھلا لکھتی بھی کس کو جب کہ کوئی دوست تھا نہ رشتے دار۔" اسماء گھبرا کر بولی تو زریں گل کو بھی اس کی بات تسلیم کر لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اصل میں تو ناصرہ بیگم کی فطرت اور مزاج بلکہ رگ و ریشے سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ خود بھی ان



لوگوں سے کوئی تعلق جوڑنا نہیں چاہتی تھیں مگر چونکہ یہ ان کے مرحوم اور محبوب شوہر کی خواہش تھی اس لیے وہ بیٹی کو اس قدر سمجھا بجھا رہی تھیں۔

ویسے بھی ان دنوں وہ شوہر کی جدائی کے غم کے علاوہ غم روزگار یا مالی افکار میں مبتلا تھیں۔ شوہر کچھ ایسا اثاثہ بھی چھوڑ کر نہ گئے تھے کہ جس پر تمام عمر تکیہ کر کے بیٹھ جاتیں۔ بس چند لاکھ کی رقم پس انداز کر رکھی تھی یا پھر یہ تین سو گز پر تعمیر شدہ مکان تھا جس کی تعمیر کچھ سرکاری قرض سے اور کچھ دو لاکھ کی اس رقم سے کی گئی تھی جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں۔ وہ بھی فواد کی بہت منت سماجت کرنے اور انہیں سمجھانے بجھانے کے بعد انہوں نے بالآخر فواد کو مکان کی تعمیر پر یہ رقم لگانے کے لیے راضی کر ہی لیا تھا اور زیورات جو بہت ہی مختصر تھے اسماء کی نیت سے لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ تھوڑی سی رقم کالج کی طرف سے بھی ملی تھی مگر وہ بھی آخر کب تک چلتی۔ آمدنی کے ذریعے مسدود ہو جائیں تو پھر بھرے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ ادھر اپنا اور بیٹی کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا اور دیگر گھریلو اخراجات، اس پر بیٹی کے تعلیمی اخراجات اور جہیز جوڑنے کی فکر۔ جیتی جان کے لیے تو اور بھی سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد رفیقے کا ساتھ جسے ایک فیملی ممبر ہی سمجھا جاتا تھا اور جس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا ماسوا ان کے، چھ سات سال کی عمر کا ان کے گھر آیا تھا۔ زریں گل اور فواد نے اسے بڑی محبت سے پالا تھا اور پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا، زریں اسے سارے کام سکھاتی گئیں حتیٰ کہ کھانا پکانا بھی۔

عدت کے بعد شروع شروع میں تو زریں گل نے یہی سوچا تھا کہ وہ کسی سماجی یا رفاہی ادارے میں کوئی ملازمت ڈھونڈ لیں گی لیکن ملازمت کا ملنا ان کے لیے ناممکن نہیں تو محال ضرور تھا کہ ان کے پاس نہ کوئی سند تھی اور نہ ہی میٹرک کا سرٹیفکیٹ تھا اور نہ ہی مہارت اور تجربہ۔

اتفاق سے چند ماہ پیشتر ہی اسی محلے میں جس میں زریں کا مکان تھا صفیہ بیگم نامی ایک بیوہ خاتون نے ایک انڈسٹریل ہوم کھولا تھا۔ یہ خاتون نہ صرف بہت

پرخلوص اور خدا ترس تھیں بلکہ بڑی دین دار بھی تھیں اور اپنے اوپر واجب پڑوسیوں کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے پڑوس کی پوری پوری خبر گیری کرتی تھیں۔ ان کی نیکی اور خلوص کی وجہ سے تقریباً" سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ خود زریں گل اور فواد بھی۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا چنانچہ جب زریں گل نے انہیں اپنے ملازمت کرنے کے ارادے سے آگاہ کر کے ملازمت دلوانے کے معاملے میں ان سے مدد چاہی تو انہوں نے زریں گل کو مشورہ دیا کہ ملازمت کرنے کے بجائے وہ ان کے انڈسٹریل ہوم میں اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے چھوٹا سا بوتیک کھول لیں اور وہ مال جو صفیہ بیگم دوسرے دوکانداروں کو سپلائی کرتی تھیں اس میں سے تھوڑا تھوڑا خرید کر اپنے بوتیک میں لگا لیں۔

زریں کو ان کی یہ رائے بہت صائب لگی اور انہوں نے کچھ ہی روز بعد ایک چھوٹا سا بوتیک کھول لیا تھا۔ لیکن جس ذوق و شوق سے کھولا تھا وہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا۔

اصل میں تو زریں گل کی طبیعت شوہر کے انتقال کے بعد سے گری گری سی رہنے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی صحت متاثر ہو کر رہ گئی تھی۔ انہیں اپنے شوہر سے والہانہ عشق تھا۔ ان کا جینا مرنا سب کچھ شوہر کے لیے ہی تھا۔ اور پھر فواد ہی دنیا میں وہ واحد ہستی تھی جنہوں نے سخت مایوس کن اور بد ترین حالات میں زریں گل کو سہارا دیا تھا۔ انہیں ٹوٹ کر چاہا تھا۔ ان پر سارا پیار نچھاور کیا تھا۔ ان کے حقوق اور عشق میں کبھی بد دیانتی نہیں کی تھی۔ بلکہ پوری صداقت اور وفاداری سے ان کا ساتھ نبھاتے رہے تھے۔

صرف زریں گل کی وجہ سے ہی اپنا شہر اور اپنے بھائی سب کو چھوڑ کر بیٹھے تھے' یوں تو تقریباً" ہر باوفا اور با محبت عورت کو اپنے شوہر پیارا ہوتا ہے لیکن زریں گل کو تو فواد کچھ اس قدر عزیز اور پیارے تھے کہ وہ ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں اور اب ان کے بغیر جی رہی تھیں کہ قدرت کے ہاتھوں مجبور تھیں یا پھر ابھی ان کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ لیکن شوہر کی مفارقت کا داغ اندر ہی اندر ناسور کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ صرف اسماء کے خیال سے کہ اسے باپ کی موت سے گہرا صدمہ پہنچا تھا اور وہ عموماً" باپ کو یاد کر کے روتی ہی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیات اور کرب کو بیٹی پر ظاہر نہیں کرتی تھیں اور غم کی دھیمی دھیمی آنچ میں اندر ہی اندر پگھلتی جا رہی تھیں۔

اس پر یہ فکر کہ ان کے بعد اسماء کا کیا حشر ہو گا ہر دم انہیں ہراساں کیے دیتی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کس طرح اور کس طور پر شوہر کی جدائی میں دو سال کاٹ گئیں۔ عمر بھی ان کی کچھ زیادہ نہ تھی صرف ۳۷ سال ہی تھی اور ان کی خوب صورتی اور تروتازگی میں بھی سر مو فرق نہیں آیا تھا البتہ بیوگی کے بعد جسم قدرے بھاری ضرور ہو گیا تھا۔

مگر دل و جان کو جو ایک روگ لگ گیا تھا وہ بالآخر ایک دن انہیں لے ہی ڈوبا اور وہ بھی دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر ڈھائی برس بعد اپنے شوہر سے جا ملیں اور اسماء سچ مچ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئی جب کہ زریں گل کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اسماء کے فرض سے سبکدوش ہو لیں۔ مگر قدرت کو شاید یہ بات بھی منظور نہیں تھی۔

زریں گل کو تو اتنا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اسماء کو صفیہ بیگم کی سرپرستی میں دے دیتیں۔ یہ ذمہ داری تو خود صفیہ بیگم نے ہی اپنے سر لی تھی جسے وہ بہ حسن خوبی اب تک نبھاتی چلی آ رہی تھیں یعنی اسماء کو تعلیم بھی دلوا رہی تھیں اور کھلا پلا بھی رہی تھیں۔

صفیہ بیگم کی اپنی بھی تین اولادیں تھیں۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

بڑی لڑکی کی انہوں نے شادی کر دی تھی مگر چھوٹی لڑکی چونکہ پیدائشی طور پر پیروں سے معذور تھی اس لیے جوان' خوش شکل اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اب تک کنواری ہی بیٹھی تھی اور لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر مزید تعلیم کے لیے انہوں نے اسٹیٹس بھیج دیا تھا



مگر وہ وہاں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بار سجا کر بیٹھ گیا تھا صرف ایک مرتبہ بیوی کے ساتھ ماں سے ملنے آیا تھا پھر کبھی آنے کی توفیق ہی نہ ہوئی تھی البتہ گاہے بگاہے تھوڑی بہت رقم ضرور بھیج دیتا تھا۔

زریں گل کے انتقال کے دو ماہ بعد ملک جواد کو جب بھاوج کے انتقال کی خبر ملی تو یتیم و یسیر بھتیجی کے لیے ان کی ممتا یکلخت بھڑک اٹھی۔ اپنی زیادتیوں اور ظلم کا تو بہت پہلے ہی انہیں احساس ہو چکا تھا اور تب ہی سے وہ بھائی سے ملنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ بھائی کی زندگی میں ہی انہوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ بھائی سے مل کر اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ لیں اور اسی کوشش میں انہوں نے بھائی کو کئی خط لکھے تھے۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعے کہلوایا بھی تھا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں مگر فواد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اصل میں بھائی کے لیے تو فواد کے دل میں ذرا میل نہ تھا بس جو کچھ تھا رنجش' کبیدگی' برائی' خفگی سب کچھ بھاوج کی طرف سے تھی کیونکہ وہ اپنے بھائی سے زیادہ اپنی بھاوج کی عیارانہ فطرت اور رگ و ریشے سے واقف تھے مگر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی حالت کے پیش نظر ان کے خیالات ملنے تو وہ بھی اپنے بھائی سے ملنے کے لیے تڑپنے لگے مگر قدرت کو دونوں کا میل منظور ہی نہیں ہوا۔

اصل میں تو ساری چالاکی ناصرہ بیگم کی تھی کہ انہوں نے اپنے شوہر کو وہ تار بھی نہیں دکھایا تھا جو فواد کے انتقال سے متعلق زریں گل نے انہیں بھجوایا تھا۔ پتا بھی چلا تو دو ڈھائی ماہ بعد وہ بھی پرویز ملک کے بڑے داماد کی زبانی جو ملتان میں ہی رہتے تھے اور اپنی بیوی فوزیہ کے ساتھ اکثر و بیشتر ملک فواد کے یہاں جایا کرتے تھے۔

بھائی کے انتقال کی خبر وہ بھی اس قدر تاخیر سے ملنے پر ملک جواد کو اتنا شدید صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہو گئے تھے۔ باپ کی وصیت۔

بھائی کی حق تلفی۔

اپنی زیادتیاں اور کوتاہیاں۔

بیوی کے جور و ستم۔

اس پر دائمی جدائی کا احساس۔

اف ایک بات ہوتی تو وہ اس کے لیے اپنے طور پر دلائل پیش کر کے اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش بھی کرتے مگر وہاں تو جس وقت سے ان کی شادی ناصرہ بیگم سے ہوئی اس وقت سے اب تک یعنی ۳۲' ۳۳ برسوں میں پھیلے ہوئے کسی ایک پل کا حساب بھی صاف نہ تھا۔

بیوی کی اصلیت تو بہت پہلے ہی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔

مگر اب تو وہ ان کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

بھائی کی دائمی مفارقت کا صدمہ ایک سانحہ بن کر ٹوٹا تو وہ بستر ہی سے جا لگے اور اسی حزنی سی کیفیت میں انہوں نے بھاوج کو بھائی کی تعزیت دینے کے ساتھ ساتھ اپنی ساری زیادتیوں اور کوتاہیوں سے متعلق ایسا درد بھرا خط لکھا کہ بھاوج کے آئینے کی طرح شفاف دل پر پڑی ان کی کبیدگی کی گرد پل کے پل میں صاف ہو گئی مگر وہ اپنے حالات میں گرفتار تھیں۔ خط کا جواب تو دے دیا تھا لیکن ناصرہ بیگم نے ان کا وہ خط ملک جواد تک پہنچنے ہی کہاں دیا بلکہ الٹا دیورانی کے خلاف زہر ہی اگلتی رہیں اور انہیں ہی اس ساری رنجش کا ذمہ دار ٹھہراتی رہیں اور ملک جواد یہی سمجھے کہ بھاوج ملنا ہی نہیں چاہتیں۔ جب بھائی ہی نہ رہا تو بھاوج اور بھتیجی سے کیا واسطہ' انہوں نے یہی سوچ کر خاموشی اختیار کر لی۔

(باقی آئندہ)

مکمل ناول

دوسری اور آخری قسط ۲

ایم سلطانہ فخر

مگر اب تو جوان جہان بھتیجی کے اس بھری دنیا میں تنہا رہ جانے کا سوال تھا۔ ناصرہ بیگم چاہ تو نہیں رہی تھیں کہ میاں کی بھتیجی ان کے گھر آکر رہے لیکن بہت دور رس اور چالباز تھیں۔ انہیں ملک پرویز کی داماد کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ فواد بیٹی کے لیے خاص جائیداد چھوڑ کے مرے ہیں اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اگر بھتیجی کو گھر لا کر رکھنے کی مخالفت کرتیں تو میاں

وہ پہلے ہی ان سے حد درجہ بدظن اور متنفر ہو چکے تھے' انہیں یقیناً" گھر سے ہی نکال باہر کرتے۔ انہوں نے اپنی زبان بند ہی رکھی اور میاں کے ملتان جانے کے ارادے میں روڑے نہیں اٹکائے اور خاموشی سے انہیں جانے دیا۔

زریں گل کا چالیسواں تھا۔ اس روز جس روز ملک جواد ملتان ان کے گھر پہنچے تھے۔ باپ کی جدائی ہی کیا کسی سانحے سے کم تھی کہ ماں نے بھی اسے اسی ظالم دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر منہ موڑ لیا تھا۔ رنج و غم کے مارے اس کی حالت واقعی مردوں سے بدتر تھی۔ وہ ماں کی جدائی کے غم میں کھانا پینا' پہننا اوڑھنا اور پڑھنا لکھنا سب کچھ بھول گئی تھی اور اس روز تو اسے غش پر غش آرہے تھے جب زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے تایا ابو کو دیکھا پہلے تو اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا مگر جب ملک جواد اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بلا منہ سے ایک لفظ نکالے زار و قطار رونے لگے۔ تب

اسماء کے والدین کی وفات کے بعد تایا اسے اپنے گھر لے آئے تھے' اسماء رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو گھر کی پرانی ملازمہ رکھی اس کے لیے دودھ لے کر آگئی۔ لیکن معمول کے مطابق اس نے دودھ کا گلاس میز پر نہیں رکھا بلکہ اس طرح کھڑی رہی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پھر بہت ڈرتے ڈرتے اس نے بتایا کہ اس دودھ میں زہر ہے اور اس کی تائی ناصرہ بیگم اسے روزانہ دودھ میں سلو پوائزن ملا کر دیتی ہیں۔ اسماء کو یقین نہیں آیا اسی وقت اس کی تائی کمرے میں آگئیں۔ انہوں نے رکھی کو ڈانٹ کر باہر نکال دیا اور اسماء کو بہت اصرار کے ساتھ دودھ پینے کے لیے کہا۔ اسماء کے دل میں کھٹک سی ہونے لگی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو کوریڈور کے سرے پر اسے اپنے تایا زاد تیمور کے کمرے کی لائٹ جلتی نظر آئی۔ وہ آگے بڑھی تو تیمور کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ناصرہ بیگم کو بتا رہا تھا کہ جو زہر اسے دیا جارہا ہے' اس سے خون آہستہ آہستہ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے اور اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اسماء زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ماہ میں دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔ اسماء کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ ماضی میں کھو گئی۔

اس نے آنکھ کھول کر کسی رشتہ دار کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی اس کے والدین نے کچھ بتایا تھا۔ دراصل اس کی ماں زرین ایک بے بس و مجبور لڑکی تھی۔ فواد نے اس کی عزت بچانے کے لیے اس سے شادی کرلی تو یہ بات ناصرہ بیگم کو شدید ناگوار گزری۔

وہ شروع سے فواد کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھیں تاکہ جائیداد کے بٹوارے کا اندیشہ نہ رہے۔ کئی بار ان کے بھائی نے فواد کو مارنا چاہا لیکن مارنے والے سے جلانے والا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ فواد ہر بار بچ گئے۔ وہ فواد کی شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی کے ذریعے زرین کو اغوا کرا دیا لیکن فواد نے ان کی یہ چال ان کے بیٹے کی کنپٹی پر پستول رکھ کر ناکام بنادی۔ تیمور کی کنپٹی پر پستول انہوں نے صرف دھمکانے کے لیے رکھی تھی۔ لیکن تیمور کے دل میں چچا کے لیے نفرت بیٹھ گئی۔

فواد اور زرین ملتان میں آباد ہو گئے۔ اسماء کے والدین کی وفات کے بعد اسماء کے تایا کو اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فواد کے حصے کی جائیداد اس کی بیٹی کو دے دیں گے۔ ناصرہ بیگم اور تیمور پر یہ سن کر بجلی گر پڑی۔ تیمور باقاعدہ پلاننگ کرکے ملتان گیا تاکہ اسماء کو ساتھ لے آئے۔

خون کی کشش نے ایک دم ہی اسے بے خود سا کردیا اور وہ ان کے سینے سے لگ کر بلک بلک رونے لگی۔

"وہ دونوں تو چلے ہی گئے جن کا میں مجرم اور خطا کار ہوں بیٹی مگر تم سے صرف اتنی التجا کروں گا، تم ان کی طرف سے میری خطائیں معاف کردو۔" خاصی دیر تک رو لینے کے بعد ملک جواد نے کہا تو روتی بلکتی اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ دونوں آپ سے بالکل خفا نہیں تھے۔ بلکہ آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ لیکن قدرت کو شاید منظور نہیں تھا۔ تایا ابو۔"

اور یوں گویا اس نے ان کو اپنے تایا کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا پھر ملک جواد پورے ایک ہفتے بھتیجی کے پاس ٹھہرے اور اس پر ہر طریقے سے زور ڈالا۔ بڑی منت سماجت کی، خوب اچھی طرح دنیا کے نشیب و فراز سمجھائے، ان نزاکتوں اور اندیشوں کا احساس دلایا جو تنہا رہنے کی صورت میں اسے پیش آسکتے تھے مگر اسماء ان کے ساتھ جانے کے لیے کسی صورت اور کسی قیمت پر تیار نہیں ہوئی۔

انکار کی وجہ تایا اور تائی سے عدم اعتمادی نہ تھی۔ بلکہ اس گھر کو جس میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی، جس کے چپے چپے سے والدین کی یادیں وابستہ تھیں اور جو اس کا اپنا تھا اسے چھوڑ کر وہ کہیں جانا نہیں چاہتی تھی اور پھر سب سے بڑھ کر پڑھائی کا سوال تھا۔ وہ ایک مقامی ویمن کالج میں فورتھ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ ماں کی علالت اور پھر دائمی جدائی کی وجہ سے پہلے ہی پڑھائی کا بہت حرج ہوچکا تھا۔ ایک سال باپ کی مفارقت کے غم میں بھی ضائع ہوچکا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی اس نے انکار کردیا تھا البتہ یہ وعدہ ضرور کرلیا تھا کہ یہ اس کا فائنل ایئر ہے، امتحان سے فارغ ہونے کے بعد چند روز کے لیے ان کے یہاں ضرور آئے گی۔

چنانچہ ملک جواد بھی جہاں تک ایک بزرگ اور تایا ہونے کے ناتے مناسب اور ممکن ہوسکتا تھا اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہہ چکے تھے۔ اب مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بے نیل و مرام ہی واپس آگئے۔

اور پھر یوں ہوا کہ ماں کے غم میں اسماء اس سال بھی امتحان نہ دے سکی۔ کیونکہ سنبھلتے سنبھلتے بھی اسے کئی ماہ لگ گئے تھے۔

ایک صفیہ بیگم ہی تھیں جو اس کا اس قدر خیال رکھتی تھیں کہ زریں گل بھی کیا رکھتی ہوں گی۔ وہ محض اپنی معذور بیٹی کی خاطر وہ انڈسٹریل ہوم کھولے بیٹھی تھیں اور اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت کی وجہ سے اسماء کے پاس آکر مستقلاً نہیں رہ رہی تھیں۔ پھر بھی ان کا بیشتر وقت اسماء کے پاس ہی گزرتا تھا۔ انہوں نے اسماء کے تنہا رہ جانے کے خیال سے شروع شروع میں اس پر بہت زور دیا تھا کہ وہ اپنا مکان کرائے پر اٹھا دے اور ان کے یہاں آرہے مگر اسماء اس بات پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئی تھی۔

وقت گزرتے دیر ہی کب لگتی ہے، سسک سسک کر یا فراٹے بھر کر وقت تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ پہلے بیتی باتیں یوں لگتی ہیں جیسے ابھی کچھ دیر قبل ہی ہو گزری ہوں لہٰذا دس گیارہ مہینے بھی ایسی ہی سرعت سے گزر گئے اور زریں گل کی برسی کا دن بھی آگیا اور یوں ماں کا تصور کرکے اور ان کو یاد کرکے اسماء کا غم پھر دوچند ہوگیا تھا۔ کہ اسی روز بہت غیر متوقع اور ڈرامائی سے انداز میں ملک تیمور اچانک آیا اور چلا بھی گیا اگر وہ عام دنوں میں سے کسی دن آتا اس کے اچانک آنے اور یوں چپ چاپ چلے جانے کی اسے پروا بھی نہ ہوتی مگر وہ آیا بھی تھا تو بعض ایسے لوگوں کے سامنے جو بات کا بتنگڑ بنانے اور بہتان باندھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور معمولی سے معمولی بات کو بھی رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے تھے۔ اور اسماء کو رنج و ملال نہیں بلکہ اس بات پر غصہ تھا کہ وہ اس کا تایا زاد بھائی تھا کوئی غیر نہیں۔ آخر وہ اسے سب کے سامنے ذلیل اور شرمندہ کرنے آیا ہی کیوں تھا۔ جب کہ دل نے اس بات کی تصدیق کردی تھی کہ وہ اس کا تایا زاد ہی ہے کیونکہ اس میں اسماء کے باپ اور تایا کی تھوڑی شباہت ضرور آتی تھی۔



اپنی قد و قامت تن و توش اور وجاہت بالکل ملک فواد کی سی تھی۔ اور شکل و صورت اور گفتگو کا انداز تایا سے ملتا جلتا۔

صفیہ بیگم تو رات ہی کو اپنے گھر واپس چلی گئی تھیں کہ شگفتہ کو فلو ہوگیا تھا اور دوسرے دن کالج سے آکر وہ گھر کی بے ترتیب چیزوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی کہ رفیقے تیمور کو ساتھ لیے ہوئے ہال میں آگیا اسے رفیقے پر غصہ تو بہت آیا مگر تیمور عین اس کے مقابل کھڑا تھا اس لیے رفیقے کو ڈانٹ بھی نہ سکی۔ کہ اس کو بتائے بغیر وہ تیمور کو کیوں اندر لے آیا۔ مگر اس کے تیور ضرور بدل گئے تھے رفیقے بھی قریب ہی کھڑا متجسس نظروں سے تیمور کو دیکھے جارہا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رفیقے سے بولی۔

"ابھی تک تم نے مجھے چائے بھی نہیں دی۔ جاؤ جلدی سے چائے بنا کر میز پر لگا دو۔" تو رفیقے تیمور کی طرف دیکھتا ہوا خاموشی سے چائے بنانے چل دیا۔

"بہت خفا معلوم ہوتی ہیں کہیں میرا آنا ناگوار تو نہیں گزرا۔" تیمور گزشتہ روز کی طرح بڑے بےباکانہ انداز میں اسے تکتا ہوا بولا۔

"جی نہیں۔ آپ کے دونوں اندازے ہی غلط ہیں کیونکہ مجھے آپ پر خفا ہونے کا کوئی حق حاصل ہے نہ آپ کی آمد و رفت سے کوئی غرض۔" وہ درشت لہجے میں بولی۔ اسے تیمور کا یوں ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا سخت کھل رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اوہو ہو۔ تو گویا میری کل کی بداخلاقی کو اس قدر خوبصورت پیرائے میں جتایا جارہا ہے۔" وہ شرارت بھرے انداز میں ہنس کر بولا۔

"جبکہ خود میں بھی اپنی اس بدتمیزی سے سخت نادم ہوں اور آپ کی خفگی کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔" اس نے ہنستے ہنستے سنجیدہ ہوکر کہا۔

"کمال ہے آپ خود ہی نہ معلوم کیا کیا سمجھ بیٹھے ہیں جبکہ میں نے تو ایسا کچھ سوچا بھی نہیں کیونکہ میں نے آپ کو بلایا تھا نہ۔۔۔۔"

"اوہ، اوہ جسٹ اے منٹ ینگ لیڈی! آپ تو واقعی بڑی سنجیدگی سے خفا ہوگئی ہیں لیکن پہلے مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع تو دے دیں۔" وہ اس کی بات درمیان سے کاٹ کر بولا اور پھر اسماء کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"دراصل میں شوق دید نے اس قدر بے قرار کردیا تھا کہ اسٹیشن سے سیدھا یہیں چلا آیا تھا۔ جبکہ سارا سامان ویٹنگ روم میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ ایک دم ہی خیال آیا کہ کوئی لے لوا کر چلتا نہ بنے تو بنا آپ کو بتائے یہاں سے چلا گیا تھا۔ بعد میں اپنی اس بداخلاقی اور آپ کی سراسیمگی کا خیال آیا جو ہمیشہ بعد میں آتا ہے تو خود کو خوب ڈانٹا پھٹکارا۔ صبح آفس اٹینڈ کرنا بھی ضروری تھا کہ یہ آفس میں میرا پہلا دن تھا۔ اس لیے وہاں سے اٹھتے ہی سیدھا یہاں آیا ہوں۔ اس توقع پر کہ آپ درگزر سے کام لیں گی۔" اس نے اپنی صفائی کچھ ایسے پیرائے میں پیش کی کہ اس کے سنجیدہ اور ملول چہرے پر ہلکی سی مسکان دوڑ گئی جسے اس نے صوفے کی پشت پر چیئر بیک ڈالنے میں چھپایا۔

"ویسے سب سے زیادہ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ اتفاق سے کل چاچی جی کی برسی بھی تھی جس میں ڈھنگ سے شرکت کرسکا نہ آپ کو تعزیت ہی دے سکا۔" اس نے اسماء کو اپنی بات کے جواب میں خاموش پا دیکھ کر پھر کہا۔

"خیر تعزیت تو اب باسی ہی نہیں ایک قصہ پارینہ سی چیز بن چکی ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں موقع اور وقت کی پابندی تو نہیں ہے جب بھی دے دیں۔" ماں کا خیال آیا تو وہ چبھتے سے انداز میں بولی اور جواب میں وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تبھی رفیقے نے آکر میز پر چائے لگا دینے کی اطلاع دی۔

"شکر ہے! یار اب اس گھر میں کہیں بیٹھنے کو تو جگہ ملے گی۔" وہ بڑی بے تکلفی سے رفیقے سے مخاطب ہوکر بولا تو اسماء کو خیال آیا کہ اپنی بے دھیانی میں وہ اسے بیٹھنے تک کو نہ کہہ سکی تھی۔ جھینپے جھینپے انداز میں رفیقے سے بولی جو سخت متجسس دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ تایا ابو کے بڑے بیٹے ملک تیمور ہیں۔ رفیقے کاکا! کل میں ان ہی کے بارے میں تم سے پوچھ رہی تھی۔ اب تم جاؤ' اور جلدی سے صفیہ آنٹی کو بلا لاؤ۔" اسماء نے اسے وہاں سے چلتا کرنے کی غرض سے کہا اور پھر تیمور سے بولی۔

"آئیں چائے پی لیں۔" تو تیمور چپ چاپ اس کے ساتھ کھانے کے کمرے میں آگیا جو ہال سے ہی ملحق تھا۔

"بائی دی وے۔ یہ آنٹی صفیہ کون ذات شریف ہیں؟" کھانے کے مختصر سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے تیمور نے پوچھا۔

"امی کی دوست اور میری گارجین۔" اس نے بتایا۔ "ویسے بہت ہی اچھی ہیں۔ بے حد مشفق اور جان چھڑکنے والی۔" اسماء نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے ساتھ ہی رہتی ہیں؟" تیمور نے ڈائننگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ساتھ تو نہیں رہتیں' البتہ جب کبھی میں بہت اپ سیٹ ہوتی ہوں تو میرا غم بٹانے کی غرض سے کچھ روز کے لیے ضرور میرے ساتھ رہ لیتی ہیں۔" وہ اس کے لیے پیالی میں چائے انڈیلتی ہوئی بولی۔

"اوہ!" اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"اصل میں آپ ہیں بھی تو دوہرے غم میں جتلا...... اب میں ان الفاظ کے چناؤ کا سلیقہ تو نہیں رکھتا جو ایسے ٹریجک موقعوں پر دلدہی اور دلجوئی کے طور پر کہے جاتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے آپ کے اس المیے پر اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ میں ابو جی کے ساتھ آپ کے مغائرانہ اور غیر روادارانہ رویے کے باوجود ٹرین سے اترتے ہی آپ کے پاس چلا آیا۔"

تیمور نے جس سادہ سے انداز میں اسے تعزیت دی۔ وہ متاثر ہی نہیں شرمندہ بھی ہو کر رہ گئی اور چائے کی پیالی اس کے آگے رکھ کر خجالت بھرے انداز میں بولی۔

"اس پر میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں مگر آپ کچھ کھائیں بھی تو۔" اور پھر اس نے بسکٹوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"لائیے شکریہ! اصل میں میں سہ پہر کی چائے پر کچھ بھی کھانے کا عادی نہیں ہوں۔" اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر اپنے آگے رکھی کوارٹر پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا اور وہ اپنے تایا ابو کے سلسلے میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہی تھی کہ اسی دم صفیہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو دونوں احتراماً" کھڑے ہو گئے پھر اسماء نے صفیہ بیگم سے اس کا تعارف کرایا تو اس نے پھر صفیہ بیگم کے سامنے اپنے چپکے سے اٹھ کر چلے جانے کی وضاحت پیش کی اور ان کو باتوں باتوں میں یہ بھی جتا دیا کہ اس کی پوسٹنگ ملتان ہو گئی ہے اور اب وہ ایک نامعلوم مدت تک یہیں رہے گا۔ چائے ختم کرنے کے بعد بھی کچھ دیر تک وہ وہیں کھانے کی میز کے آگے بیٹھا صفیہ کو کراچی کے موسم اور گہما گہمی کے بارے میں بتاتا رہا اور پھر ان سے اجازت لے کر چلا گیا۔

وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے نہیں گیا تھا مگر چوتھے یا پانچویں روز از خود ہی چلا آیا تھا۔ اتفاق سے اس روز بھی صفیہ بیگم اسماء کے گھر میں ہی موجود تھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر پھر بیگانوں کی طرح اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس روز بھی وہ سہ پہر کو ہی آیا تھا۔

اسماء اس کی باوقار گمبھیر اور پرکشش شخصیت سے کافی حد تک مرعوب ہو گئی تھی اور پھر وہ کوئی غیر تو نہ تھا بلکہ سگا تایا زاد تھا۔

سگا خون تھا۔

اصل میں تو پہلی نگاہ میں ہی وہ اس کے من کو بھا گیا تھا مگر اس پسندیدگی میں کسی سرپھرے جذبے کو بالکل دخل نہ تھا۔ تیمور سے یگانگت اور رواداری برتنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تیمور نے اپنے والد کے ساتھ جانے پر اس کے انکار کو اس کی مغائرت اور بیگانگی پر محمول کیا تھا جبکہ اسماء نے اپنی مجبوریوں کے تحت ہی اپنے تایا کے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا اور یہی بات وہ تیمور کو سمجھانا چاہتی تھی جس کا اب تک اسے موقع ہی نہ ملا تھا۔

اس روز شاید دانستہ ہی وہ سورج غروب ہونے کے بعد آیا تھا۔ اسماء اپنے کمرے میں بیٹھی اگلے دن کے



لیے نوٹس تیار کر رہی تھی۔ رفیق باورچی خانے میں رات کے کھانے کے لیے آٹا گوندھ رہا تھا اور صفیہ آنٹی نے چند روز قبل اس کی تنہائی کے خیال سے اپنی ایک پرانی ملازمہ محمودہ جسے عرف عام میں سب مودان کہتے تھے اس کے پاس رہنے کے لیے بھیجی تھی۔ وہ مغرب کی نماز ادا کر کے عقبی برآمدے میں نماز کی چوکی پر ہی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ بیرونی دروازہ بھی بند تھا پھر بھی جانے کیسے اور کیونکر تیمور اندر آگیا۔ وہ بھی عین اس کے کمرے میں۔

"ہیلو' کیا ہو رہا ہے؟" اس نے اسماء کے پیچھے کھڑے ہو کر پوچھا تو اسماء اس بری طرح سے اچھلی کہ نوٹس کی کاپی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری جسے اٹھا کر اسے دیتے ہوئے تیمور نے کہا۔

"اوہ' آپ تو ڈر گئیں۔ اصل میں میں بہت ان ایکسپیکٹڈ بھی تو آگیا ہوں۔" اپنی بات کہتے سمے اس کے خوبصورت چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ اسماء کا دل چاہا کہ کہے نہیں آپ کا ان ایکسپیکٹڈ آجانا اتنا تعجب خیز نہیں جتنا کہ بلا اجازت میرے کمرے میں آجانا' مگر وہ خاموش ہی رہی۔ البتہ اس کے چہرے پر ایک ناخوشگوار سا تاثر ضرور پھیل گیا۔

"اوہ' سمجھا۔ آپ کو میرا اپنے کمرے میں یوں بے دھڑک آجانا بہت ناگوار گزرا ہے لیکن میں بھی کیا کروں جب بھی آپ سے ملنے آتا ہوں آپ کی وہ باڈی گارڈ قسم کی زبردست چیز صفیہ آنٹی یہاں ضرور موجود ہوتی ہیں جن کی وجہ سے میں آپ سے دل کی باتیں کہنے سے بھی محروم رہ جاتا ہوں۔" تیمور نے اتنی روانی سے اپنی بات کہی کہ اس کے آخری فقرے پر شرم سے سرخ پڑ جانے کے باوجود اسماء کو ہنسی آگئی جسے اس نے سختی سے دبا کر کہا۔

"لیکن وہ مستقل طور پر تو یہاں نہیں رہتیں اور اگر رہتیں بھی تو آپ تو میرے اپنے ہیں۔ انہیں بھلا کیا حق پہنچ سکتا تھا اعتراض کرنے کا۔" تو تیمور نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بڑے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"ہائیں' ذرا زور سے کہیے مجھے بالکل سنائی نہیں دیا۔" اور اس کی شرارت پر ہنسی کی ایک مدھری پھوار اسماء کے موتیوں کی طرح جڑے چمکیلے اور خوبصورت دانتوں کو نمایاں کر گئی مگر اس نے فوراً" ہی اپنی ہنسی پر بند باندھ کر کہا۔

"ہاں تو کیا آپ میرے فرسٹ کزن نہیں ہیں' میرے سگے تایا زاد۔"

"ہاں ہاں بلاشک و شبہ' بلا شرکت غیرے۔" اس نے ذو معنی سا فقرہ کہا اور پھر ہنسنے لگا۔

"ویسے بھی آپ آنٹی کو اپنا ہی سمجھیے —— وہ سچ مچ امی کی کمی کو پورا کر رہی ہیں بلکہ پوری صداقت سے حق دوستی ادا کر رہی ہیں اور آپ کے آنے سے وہ بھی اسی قدر خوش ہیں جتنی کہ میں ہوں بلکہ وہ تو یہی کہتی ہیں کہ تیمور نے اتنی غیریت کیوں برتی کہ اپنا گھر موجود ہوتے ہوئے کسی ہوٹل میں ٹھہرے۔" اسماء اس کے فقرے کو نظر انداز کر کے بولی۔ جواب میں وہ خاموشی

سے مسکراتا رہا۔
"اور اس بات پر تو میں بھی آپ سے سخت شاکی ہوں کہ یہاں رہنے کے بجائے ہوٹل میں کیوں رہ رہے ہیں۔" اسماء نے اسے خاموش سا دیکھ کر پھر کہا۔
"لیکن میں ہوٹل میں تو نہیں رہ رہا بلکہ ایک کولیگ کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہ رہا ہوں۔"
"مگر آپ نے اتنی غیریت کیوں برتی؟"
"غیریت میں نے نہیں آپ نے برتی ہے۔ ابو جی آپ کو لینے آئے تو آپ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا اور کبھی ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔ یہ تو میں ہی تھا جو خود ہی کھنچا کھنچا چلا آیا۔"
تیمور کی بات پر وہ چپ سی ہوگئی کہ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔
"اور پھر مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں کسی اور جگہ رہائش اختیار کروں۔" وہ پھر بولا۔
"کیسی مصلحت۔" اسماء نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔
"بھئی یہی کہ میرے یہاں رہنے پر لوگ اعتراضات نہ کرنے لگیں کیونکہ آپ اس گھر میں تنہا ہی تو رہتی ہیں اور مجھ سے یہاں کوئی واقف بھی نہیں۔" اف اس نے کتنی پتے کی بات کہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں قائل ہوگئی۔
"آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا۔" اسماء نے گفتگو کا رخ موڑا۔
"کچھ نہ کچھ پینا کیا بہت ضروری ہے۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔
"گرمی ہو رہی ہے، اس لیے میرے خیال میں تو ٹھنڈا ہی مناسب رہے گا۔" اسماء نے اس کے سوال کو گول کرتے ہوئے کہا اور پھر رفیقے کو آواز دے کر بلایا۔ کچھ ہی دیر بعد رفیقا آیا تو اس کے کمرے میں تیمور کو بیٹھا دیکھ کر آنکھیں پٹ پٹاپٹ پٹا کر اسے دیکھنے لگا۔ اسماء کو اس کی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔
"دیکھ کیا رہے ہو یہ اپنے چھوٹے ملک ہیں۔ ان کے لیے سنگترے کا جوس نکال کر لاؤ مگر ٹھنڈا کر کے لانا اور ہاں وہ فریج میں جو آئس کریم کیک رکھا ہے وہ بھی لیتے آنا۔"
"جو حکم بی بی۔" رفیقے اسی طرح حیران و پریشان سا الٹے پیروں واپس چلا گیا۔
"یہ آپ کو یہاں دیکھ کر اس قدر حیران ہو رہا تھا کیونکہ بیرونی دروازہ تو بند تھا نا۔"
"جی ہاں اور میں عین ان کے پہلو سے ہی گزر کر عقبی دروازے سے آیا ہوں مگر اس وقت یہ آٹا گوندھنے کے ساتھ ساتھ ہیر گانے میں مصروف تھے۔" تیمور نے ہنس کر کہا۔ "بائی دی وے، آپ کے آج کل کیا مشاغل ہیں؟" اس نے گویا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔
"کوئی خاص تو نہیں سوائے پڑھائی کے۔ اگر پچھلا سال ضائع نہ ہوتا تو کب کا گریجویشن کرلیا ہوتا۔" اس نے بتایا۔
"مگر کیا آپ کسی ضرورت کے تحت اتنا پڑھ رہی ہیں؟"
"علم کسی ضرورت کے تحت تو حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ وہ خود انسان کی ایک ضرورت ہوتا ہے۔" اس نے چبھتے سے لہجے میں کہا۔
"اوہ گڈ یو آر ویری کلیور۔"
"شکریہ۔" اسماء نے مسکرا کر کہا۔ تبھی رفیقے ٹرے میں سنگترے کا رس اور آئس کریم کیک اور پلیٹیں سجائے اندر آگیا۔ تو وہ اس کی خاطر و مدارات میں لگ گئی۔
"اصل میں اسی پڑھائی کی وجہ سے کہ پچھلا سال بھی ضائع ہوچکا ہے۔ میں تایا ابو کے ساتھ نہیں جاسکی تھی اور میں نے اپنی اس مجبوری کا ان پر اظہار بھی کردیا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ مجھ سے ناراض ہوگئے۔" اس نے آخر بہت دن سے دل میں آئی بات کو اس کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔
"کیونکہ ہمارے یہاں بزرگوں کے سامنے بڑی سے بڑی مجبوری بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور وہ بڑے مان اور زعم سے آپ کو لینے آئے تھے اور آپ ہیں کہ آپ نے انہیں مایوس ہی کردیا۔"
"اوہ! میں واقعی ان سے سخت شرمندہ ہوں۔" وہ



متاسف اور پشیمان سی ہو کر بولی۔
"خیر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابو کو خط لکھ کر ان کی ناراضگی دور کردوں گا۔" اس نے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے جانے کے بعد معصوم، سادہ لوح اور فراخ دل اسماء بڑی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔
اس کا بے تکلفی اور اپنائیت سے بات کرنا۔
ہنسنا مسکرانا۔
دیکھنے کا بے باکانہ سا انداز۔
اس کی ہر بات۔
ہر ادا۔
اس کے لیے بڑی خوش کن ثابت ہوئی تھی۔
کہ وہ اس کا سگا تایا زاد تھا۔
اور اسی بات سے تو اسماء کا کھوٹ سے پاک اور صاف دل کھل کھل اٹھتا تھا کہ وہ اس سے ملنے آتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی اپنی دلچسپ اور پُرلطف بھری باتوں سے اس کی بوریت دور کردیتا ہے۔
اگلی مرتبہ وہ آیا تو اتفاق سے صفیہ بیگم بھی موجود تھیں۔ وہ زیادہ وقت ان ہی سے باتیں کرتا رہا اور جب ادھر ادھر کی باتوں کے بعد صفیہ بیگم نے اس سے پوچھا۔
"بیٹا! کیا تم کسی سرکاری محکمے میں ملازم ہو؟"
"جی نہیں وہ سرکاری محکمہ نہیں البتہ نیم سرکاری یعنی سیمی گورنمنٹ محکمہ ہے، جس میں ملازم ہوں۔" اس نے قدرے گول مول سے انداز میں بتایا۔
"اچھا، مگر کیا عہدہ ہے تمہارا؟" صفیہ آنٹی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
"کسی اعلا اہمیت کا حامل نہیں ہے بس معمولی درجے کا ملازم ہوں، مزدور ہی سمجھ لیجیے۔" وہ حد درجہ انکساری سے کام لیتا ہوا بولا۔
"اچھا کم از کم اتنا ہی بتادو کہ وہ کون سا محکمہ ہے۔" صفیہ بیگم نے اس کے ٹال مٹول کرنے پر مسکرا کر پوچھا۔
"وہ جی بس آنٹی! گاڑیوں کے پارٹس کی سپلائی کرنے کی ایک فرم ہے۔" اس نے پھر گول مول سا جواب دیا تو صفیہ بیگم سمجھ گئیں کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہا۔
"اچھا چلو۔ اپنا فون نمبر ہی بتادو کہ کبھی ضرورت پڑے تو تمہیں فون ہی کرلیا جائے؟" صفیہ بیگم نے ایک آخری کوشش کی۔
"ایسی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے آنٹی! میں تو ہر دوسرے تیسرے دن چلا ہی آتا ہوں۔ اصل میں فون آفس کے کاموں کے لیے مختص ہے۔ میرے ذاتی مصرف کے لیے نہیں ہے۔" اس نے کچھ اس قدر نروٹھے پن سے کہا کہ صفیہ بیگم اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اس روز وہ خود بھی خاموش خاموش سا تھا۔ زیادہ دیر ٹکا بھی نہیں اور جلد ہی اٹھ کر چلا گیا اور صفیہ بیگم جو اب بھی اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھیں۔ اس کے گول مول سے جوابوں پر کچھ زیادہ ہی کھٹک گئیں مگر انہوں نے اپنے خدشات یا شکوک کا اظہار اسماء کے سامنے نہیں کیا۔
پھر وہ ایسا غائب ہوا کہ دس بارہ روز تک آیا ہی نہیں جبکہ وہ تقریباً ہر روز ہی اس کی آمد کی متوقع رہتی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے آئندہ آنے کا کہہ کر ہی کب جاتا تھا۔ بس جب اس کا موڈ بنتا، جس وقت جی چاہتا خود ہی اس سے ملنے چلا آتا تھا۔ صفیہ بیگم اس دوران کئی مرتبہ دبے دبے لفظوں میں اسے جتا بھی چکی تھیں۔
"یہ ملک تیمور تو نہ جانے کہاں غائب ہوگئے۔ اپنے محکمے کا پتا نہیں تو کم از کم اپنا فون نمبر ہی بتا دیتے تو ہم ان کی خیریت تو معلوم کرلیتے اگر برا نہ مانو تو میں کہوں گی کہ کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے۔"
"چکر کیا ہوگا آنٹی جی! بس وہ ذرا لاابالی سے لگتے ہیں اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے انہیں فرصت ہی نہ ملی ہو۔" اس نے کہا۔
"لیکن کم از کم تم نے ہی اتنا معلوم کرلیا ہوتا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟" صفیہ بیگم نے کہا۔
"فائدہ ہی کیا ہوتا پوچھنے سے جب وہ بتانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی آنٹی! وہ خود ہی مجھ سے ملنے آجاتے ہیں۔ کوئی میں تو ان کو نہیں بلاتی اور پھر آپ کو

تو معلوم ہی ہے۔ ہمارے بزرگوں کے تعلقات ماضی میں کس قدر کشیدہ رہ چکے ہیں۔ اب اگر وہ نہیں آئیں گے تو میں ان کے پیچھے بھاگنے سے تو رہی۔" اسماء نے یہ کہہ کر صفیہ بیگم کو لاجواب سا کر دیا تھا مگر اندر ہی اندر اسے بھی ایک بے چینی سی لگی ہوئی تھی۔

وہ اس روز اپنی ایک ایرانی نژاد ہم جماعت اور سہیلی دریہ بخاری جو اگلے ہفتے ایران جا رہی تھی سے ملنے جا رہی تھی۔ تنہا وہ کہیں آتی جاتی نہ تھی اس لیے موداں کو اپنے ساتھ لے جا رہی تھی اور ابھی تیار ہی ہوئی تھی کہ تبھی وہ اچانک آگیا۔

اسماء میک اپ تو کبھی کرتی ہی نہ تھی البتہ اس نے اس روز بڑی نفاست سے آئی لائنگ کی تھی اور ہونٹوں پر لپ گلاس بھی لگایا تھا۔ ناک میں دمکتی ہیرے کی لونگ، کانوں میں سچے موتیوں کے ننھے سے آویزے اور انگلی میں اسی کے ساتھ کی انگوٹھی، آسمانی اور سفید رنگ کی اسٹرائیڈ چکن سلک کا سوٹ اور سوٹ کے ساتھ کا ڈبل پاٹ کا دوپٹہ۔ اسے اس نے پیچھے سے پھیلا کر اپنے دونوں شانوں پر ڈال رکھا تھا۔

اف، اس قدر سادگی میں بھی اس قدر حسن، اتنا جمال

اتنی تازگی اور تابندگی کہ دوسرا دیکھے تو دیکھتا ہی چلا جائے۔

تیمور بھی مبہوت سا۔۔۔ سحر زدہ سا موداں کی موجودگی کو فراموش کر کے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہی رہ گیا اور اسماء کو اس کی یہ بے ساختگی سخت گراں گزری۔

وہ جلدی سے موداں کی طرف گھوم کر بولی۔

"ماسی! رفیقے سے کہہ دو ابھی ٹیکسی نہ لائے۔ یہ چھوٹے ملک جی آگئے ہیں نا۔"

"چنگا بی بی۔" موداں نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

"اوہو، کہیں جا رہی تھیں آپ تب ہی تو یہ ٹھاٹھ ہیں۔" موداں کے جانے کے بعد اسے روگردانی کرتا دیکھ کر تیمور نے اپنے ہوش و خرد کی دنیا میں آتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے ورنہ گھر میں تو یوں بن ٹھن کر نہیں رہتی۔" وہ روکھے سے لہجے میں بولی۔

"حالانکہ رہنا چاہیے۔" وہ مسکرا کر بولا تو اس نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

"آیئے، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" لہجہ بیزار کن سا تھا۔

"ارے نہیں۔ آپ کو جہاں جانا ہے چلی جایئے، میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کی بیزاری کو محسوس کرنے کے باوجود بھی خوش دلی سے بولا۔

"نہیں وہاں جانا ایسا کوئی ضروری تو نہیں۔ میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔"

"بھئی یہ اچھی فارمیلٹی ہے ابھی تو آپ میرے اچانک آجانے پر اس قدر بیزار ہو گئی تھیں کہ نظر نہیں ملا رہی تھیں یا اب یہ عالم ہے کہ پروگرام ہی کینسل کر دیا۔" تیمور نے گردن بھنبوڑا کر کہا تو اسماء کا دل چاہا کہے کہ میں آپ کے آجانے سے نہیں بلکہ اس قدر بد تمیزی سے گھورنے پر برا مان گئی تھی اور یہ بات آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے پھر بھی آپ اس قدر بن رہے ہیں مگر فطری جھجک آڑے آگئی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"نہیں، میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی ارادہ بدل دیا تھا۔ خیر آپ اندر تو چلیے۔"

تو تیمور چپ چاپ اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگیا۔

دبیز پردوں سے ڈھکے ڈرائنگ روم میں اس وقت خاصا اندھیرا تھا۔ اسماء نے کورنرز میں لگی لائٹس جلا دیں اور اسے بٹھا کر خود بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ برقی روشنیوں میں اس کا سادہ حسن کچھ زیادہ ہی چمکنے لگا۔ تیمور کی نظریں اس پر پڑتیں تو کچھ دیر کے لیے جم کر رہ جاتیں اور دل میں کچھ ایسی میٹھی میٹھی سی کسک ہوتی کہ وہ پہلو بدل کر رہ جاتا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ وہ اسماء کو دیکھنے میں محو تھا اور اسماء نظریں جھکائے اس سے بات کرنے کے لیے

موضوع تلاش کر رہی تھی پھر اسماء نے رفیقے کو آواز دے کر اس کے لیے کولڈ ڈرنکس منگوائیں اور اس سے پوچھا۔

"دیکھیے' آپ ٹھیک ٹھاک تو رہے اتنے دن؟"

"کتنے دن؟" اس نے اپنی مسکراہٹ دبا کر پوچھا تو وہ سٹ پٹا سی گئی۔

"...یہی جو آپ دس بارہ روز تک غائب رہے؟"

"تو کیا آپ میرا انتظار کرتی رہیں؟" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

"ظاہر ہے کوئی آتے آتے بلاوجہ ہی رک جائے تو اس کا انتظار ہی رہتا ہے۔" وہ نگاہیں کترا کر سرد سے لہجے میں بولی۔

"ہاں دیٹس کریکٹ اصل میں مجھے بڑا شدید قسم کا فلو ہو گیا تھا اس لیے آنا ہی نہ ہو سکا۔" اسماء کا دل تو چاہا کہے کہ اسی لیے تو آپ کا پتا پوچھا تھا۔ تاکہ آپ کی خیریت معلوم ہو سکے۔ مگر دل کی بات دل میں ہی رکھ کر اس نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن بظاہر تو آپ بڑے فریش نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں وہی مثل ہے کہ۔"

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!

اس نے ہنس کر بڑی بے ساختگی سے یہ شعر پڑھا تو وہ کٹ کر رہ گئی اور وہ اس کے حسین تر چہرے پر جھلکتے خوب صورت رنگوں کو دیکھتا رہ گیا اور تب اس نے اس کے دیکھنے کے انداز پر بگڑ کر بڑی تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سنا ہے چاچی جی بھی بہت حسین و جمیل تھیں۔" وہ اس کی تیکھی نظروں کا مفہوم سمجھ کر دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس نے بھی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ محجوب سے انداز میں بولی۔

"اچھا۔ کس سے سنا تھا آپ نے؟"

"بھئی امی جی اور رشتے داروں سے ہی سنا تھا۔" وہ بدستور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"جی ہاں وہ واقعی بے حد حسین تھیں حتیٰ کہ اس عمر میں بھی بہت ینگ سی لگتی تھیں اور سچ پوچھیے تو وہ زیادہ عمر کی بھی نہیں تھیں۔ یہی کوئی ۳۸۔۳۹ سال کی ہوں گی۔" ماں کا ذکر چھڑا تھا تو وہ ان کی تعریف ہی کرتی گئی۔

"ہاں' مجھے افسوس ہے تو اسی بات کا کہ میں چاچی جی کی دید سے محروم ہی رہا۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

"ہاں' قدرت کو منظور ہی نہیں ہوا کہ آپ لوگ امی اور ابو کی زندگی میں ان سے مل سکیں۔" وہ بے حد ملول ہو گئی۔

"لیکن ابو جی بھی کچھ کم خوب صورت نہیں تھے۔" اس نے مزید کہا۔

"ہاں' چاچا جی سے ملنے اور انہیں دیکھنے کا تو مجھے بہت ہی اشتیاق تھا مگر یہ حسرت بھی دل کی دل میں ہی رہ گئی۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"لیکن ابو کو تو آپ نے بچپن میں دیکھا ہی ہو گا۔ امی بتاتی تھیں کہ آپ پانچ چھ برس کے تھے جب ان کی شادی ہوئی تھی۔" اس نے کہا۔

"ہاں دیکھا ضرور تھا مگر یاد بالکل نہیں۔ ایک دھندلا دھندلا سا خاکہ ضرور ذہن میں آجاتا ہے وہ بھی تھوڑے تھوڑے ڈراؤنے انداز میں۔"

"ڈراؤنے انداز میں؟ میں سمجھی نہیں۔" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"ہاں وہ اصل میں چاچا جی بہت غصیل اور سخت گیر تھے نا' ان سے تو میری روح فنا ہوتی تھی۔" اس نے تھوڑا سا ہنس کر بتایا۔

"اچھا تعجب ہے ورنہ ابو تو اتنی ٹھنڈی اور نرم مٹی سے اٹھائے گئے تھے کہ غصہ یا سختی ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ بڑے حلیم الطبع' مہربان' مشفق خدا ترس اور دوسروں کی خاطر تکلیفیں اٹھانے والے۔ میرے خیال میں آپ کے لاشعور میں ان کی طرف سے ڈر بیٹھ گیا ہو گا۔ یا بچپن میں انہوں نے آپ کی کسی شرارت پر آپ کو ڈرایا دھمکایا ہو گا۔" وہ اپنے باپ کی حمایت میں اس کے غلط اندازوں کی تردید کرتی ہوئی بولی۔ تو تیمور نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔



"اجی شرارت پر ڈرانا دھمکانا کیسا انہوں نے تو ایک مرتبہ غصے میں آ کر بھرا ہوا پستول میری کنپٹی سے لگا دیا تھا۔"

"ہائیں بھرا ہوا پستول لگا دیا تھا؟" مارے تعجب کے وہ تھوڑا سا اچک کر بولی۔

"ہاں بھرا ہوا پستول۔ بس زندگی تھی جو بچ گیا۔ ورنہ انہوں نے مجھے مارنے میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"اوہ۔ نہیں' نہیں یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ ابو کی عادات واطوار اور فطرت سے میں بخوبی واقف ہوں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"اجی تو جھوٹ بول کر کیا مجھے آپ سے ٹرافی لینی ہے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"تب عین ممکن ہے کہ انہوں نے مذاق یا لاڈ میں ایسا کیا ہو۔"

"اچھا تو کیا بھرا ہوا ریوالور کنپٹی سے لگا کر بچوں سے لاڈ یا مذاق بھی کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں وجوہات کچھ اور ہی تھیں۔ خیر چھوڑیے گڑے مردے اکھیڑنے سے فائدہ۔ جو ہو چکا رفت گزشت۔" وہ اسماء کے تجسس کو بھڑکانے کی غرض سے بات کو لاپروائی میں اڑاتا ہوا بولا۔

"نہیں' نہیں' اب تو آپ کو بتانا ہی ہو گا۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ آپ نے میرے مرحوم باپ پر تہمت باندھی ہے۔" اس کے بات ٹالنے پر اسماء نے بگڑ کر کہا بھی تو بھلا کیا۔ تیمور کو برا تو بہت لگا مگر وہ تحمل سے کام لے کر بولا۔

"ایسا تو کوئی بے ظرف اور بد بخت ہی ہو گا جو اپنے سگے اور مرے ہوئے چچا پر کوئی تہمت لگائے۔ ورنہ میں تو صرف اس وجہ سے اس موضوع سے گریز کر رہا تھا۔ کہ جن باتوں سے آپ یکسر لاعلم ہیں انہیں چھیڑنے سے فائدہ؟" ہزار ضبط کے باوجود بھی وہ اپنی برہمی کو نہ چھپا سکا۔

"مگر ان باتوں کا تعلق براہ راست میرے والدین سے ہی تو ہے۔" اسماء کو ایک غلط فقرہ بول جانے کا احساس ہوا تو اس نے جلدی سے کہا۔

"ہاں' مگر عجیب سا تو لگتا ہے نا مگر اب آپ مصر ہی ہیں تو۔" تیمور نے اتنا کہہ کر تھوڑا سا توقف کیا پھر بولا۔

"بھئی وہ اصل میں سارا قضیہ چاچی جی سے شادی کرنے کے سلسلے میں تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر امی' ابو اس رشتے کے سخت مخالف تھے اور کسی طرح راضی ہی نہ ہوتے تھے اور ان کو آمادہ کرنے کے لیے ہی مرحوم چاچا جی نے یہ ترکیب آزمائی تھی کہ میری کنپٹی سے بھرا ہوا ریوالور لگا کر کھڑے ہو گئے تھے اور مزے کی بات یہ کہ اپنی بات منوانے سے پہلے ہی انہوں نے خفیہ طور پر چاچی جی سے شادی بھی کر لی تھی۔"

"خفیہ طور پر..." اسماء کے گلے میں جیسے کچھ پھنس سا گیا۔

"ہاں خفیہ طور پر ہی۔ وہ اصل میں بات ہی کچھ ایسی تھی۔ خیر جانے دیں۔ یہ آپ کی مرحومہ امی کا معاملہ ہے خواہ مخواہ میں آپ کی فیلنگز ہرٹ ہوں گی۔"

"یہ آپ ہر بات میں میری فیلنگز کا ذکر کیوں کر رہے ہیں جبکہ میں تو بڑی سے بڑی بات برداشت کر لینے کی عادی ہوں۔" اس کے یوں موڑ توڑ کر بات کرنے پر وہ چڑ کر بولی کہ اس کا تجسس انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

"بھئی' وہ اصل میں میں خود بھی پسند نہیں کرتا کہ..." وہ اپنی گدی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

"بس یوں سمجھ لیں کہ خدا غریق رحمت کرے چاچی جی کو' وہ اچھی شہرت کی حامل نہیں تھیں۔" اس نے بہت جھجکتے۔ ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"میری امی جی اچھی شہرت کی حامل نہیں تھیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ یوں تلملا کر بولی۔ جیسے کسی بھڑ نے اسے ڈنک مار دیا ہو اور وہ اس کے بھڑک اٹھنے سے بری طرح بوکھلا اٹھا۔

"نہیں نہیں میرا مطلب ہے کہ مرحومہ کسی وجہ سے حالات کا شکار ہو گئی تھیں اور پھر..."

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ وہ بہت غریب اور نادار

تھیں؟" اس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔
"ہاں ہاں بے چاری لاوارث بھی تھیں۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔
"یعنی میری طرح؟" اس نے طنز بھرے انداز میں پوچھا۔
"نہیں نہیں آپ خدا نہ کرے لاوارث کیوں ہونے لگیں۔ کیا آپ کے خیال میں ہم سب مر گئے ہیں۔" وہ بڑی چالاکی سے بات کو گھماتا ہوا بولا۔
"ہوں تو میری ماں بہت غریب اور نادار تھیں اس لیے آپ جیسے رئیس لوگوں کی نظر میں اچھی شہرت کی حامل نہیں تھیں اور اسی وجہ سے تایا اور تائی انہیں اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے تھے۔" اسماء کو اپنی ماں کے متعلق تیمور کے خیالات سن کر سخت غصہ آ رہا تھا کہ اس کے بات گھمانے کے باوجود وہ اسی موضوع پر بات کر رہی تھی۔
"بھئی میں اسی وجہ سے تو بتانا نہیں چاہ رہا تھا کہ آپ برداشت نہ کر سکیں گی مگر آپ تو میرے سر ہی ہو گئیں۔" اس نے اسے غصے میں دیکھ کر ناگواری سے کہا۔ مگر اس نے جیسے اس کی بات ہی نہیں سنی۔
"اچھا تو میری ماں کی غربت کی وجہ سے ہی تائی اماں کا سلوک ان کے ساتھ اس قدر جارحانہ اور ناروا تھا کہ ابو کو نہ صرف علیحدہ ہونا پڑا بلکہ تعلقات بھی قطع کرنے پڑے؟"
"نہیں ــــ خیر تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے نہیں۔ اسماء مانا کہ امی جان بہت تند خو اور بد مزاج ہیں مگر چاچی جی بھی اتنی خاموشی سے ان کی زیادتیوں کو برداشت نہیں کرتی ہوں گی۔ ویسے بھی جیٹھانی اور دیورانی کے رشتے میں عموماً" آپس کی جیلسی کار فرما ہوتی ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ چاچی جی نے ہی چاچا کو مجبور کر کے علیحدہ گھر لیا تھا جس کا ابو کو اتنا قلق تھا کہ انہوں نے بھائی سے ناراض ہو کر تعلق ہی قطع کر لیا تھا اور بعض رشتے دار تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ چاچی جی نے غصے میں آ کر امی جی کے تھپڑ مارا تھا بس اسی بات پر بات اتنی بڑھی کہ آپس میں القطع القطعی ہو گئی۔" اس نے مزید انکشافات کیے۔
"اچھا۔ اصل میں مجھے کسی بات کا علم ہی نہیں ابو اور امی نے تو ہمیشہ مجھے اندھیرے میں ہی رکھا۔" وہ قدرے نرم پڑ کر بولی۔
"مگر یہ تو انہوں نے کوئی دانشمندی نہیں کی کیونکہ انہیں سب سے پہلے آپ کو ہی ہر بات سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا۔ اب اسی سے اندازہ لگا لیں کہ کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی جس کی وجہ سے انہوں نے آپ سے ہر بات چھپائی۔"
"ہاں' یہ انہوں نے میرے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا۔" وہ افسردہ سی ہو کر بولی۔
"ارے چھوڑیں' اب ان باتوں پر رنج کرنے سے فائدہ؟ میں تو امی جان سے بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ رونا دھونا چھوڑ دیں کہ قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے اسے بدلا جا سکتا ہے نہ مٹایا مگر امی جان میری سنتی ہی کب ہیں' بس رو رو کر یہی کہتی ہیں کہ کاش ایک مرتبہ ہی مجھے موقع مل جاتا ملتان جانے کا تو میں ہر قیمت پر فواد اور زریں کو منا کر گھر لے آتی۔ ہونہہ۔ اب پچھتانے اور رونے رلانے سے بھلا فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو بہت پہلے ہی سوچنے کی بات تھی کہ ایسی نوبت ہی کیوں آئی؟ کیوں اس قسم کے حالات پیدا ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کی صورتوں کو ہی ترس گئے۔" وہ کہتا رہا اور وہ خاموش بیٹھی بڑی توجہ سے سنتی رہی کہ تیمور کی زبان سے نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے۔
"ویسے سچ پوچھیں تو ایک بات ضرور کہوں گا کہ امی جان خواہ زبان اور مزاج کی کتنی ہی تیز کیوں ہیں مگر دل کی ہرگز بری نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے اپنی غلطی اور زیادتیوں کو جلد ہی محسوس کر لیتی ہیں اور اپنی زیادتیوں کو انہوں نے بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اسی وجہ سے وہ چاچا چاچی سے تعلقات استوار کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن شاید چاچا' چاچی نے خود ہی یہ گوارا نہ کیا تھا نہ جانے کیا بات تھی۔" اور تیمور کی اس بات پر وہ بھی دل ہی دل میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ہاں واقعی کوئی وجہ ہی ہو گی جب ہی تو امی نے بھی یہی بتایا تھا کہ تایا ابو تو بہت عرصے سے مصالحت کرنا چاہتے تھے مگر تمہارے ابو نے ہی گوارا نہیں کیا تھا۔



"مگر اس کے باوجود بھی امی جان مصالحت کے لیے بے تاب تھیں۔" تیمور نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"اب اسی بات سے اندازہ لگا لیں کہ جب چاچا کا انتقال ہوا تھا تو وہ بے چین اور بے قرار تھیں کہ کسی طرح آپ کو اور چاچی کو اپنے پاس بلا لیں۔ ابو کو انہوں نے ہی مجبور کر کے خط لکھوایا تھا مگر چاچی جی نے تو ابو کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ اور جب چاچی جی بھی رحلت کر گئیں تو کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گیا تھا جب امی ابو سے یہ نہ کہتی ہوں کہ اسماء کو میرے پاس لے آؤ۔ ابو جی تو خود بھی آپ کی طرف سے متفکر تھے اور اسی لیے آپ کو لینے آئے تھے مگر آپ نے انکار کر کے ان کا دل توڑ دیا۔ اس کے باوجود بھی امی جان نے ہار نہیں مانی۔ وہ برابر مجھ پر زور دیتی رہیں کہ اب تم جا کر اسماء کو لے آؤ جبکہ میں سمجھا سمجھا کر تھک گیا کہ جب اسماء ابو جی کے ساتھ نہیں آئیں تو پھر بھلا میرے ساتھ کیونکر آئیں گی مگر امی جان کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ وہ تو یہ بھی محض ایک اتفاق ہی تھا کہ محکمے کی طرف سے بہت اچانک میرا ٹرانسفر یہاں کر دیا گیا۔" وہ بلا تکان ایک روانی اور جوش کے عالم میں بولتا ہی چلا گیا۔
"ہاں۔ امی جی کے بقول کہ کوئی ناخنوں سے گوشت تھوڑی علیحدہ ہوتا ہے۔" اسماء اس کی باتوں سے حد درجہ متاثر ہو کر بولی۔
"ظاہر ہے۔ ظاہر ہے' اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔" اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
"ہاں وہ تو ہوتے ہی ہیں مگر آپ یہ جوس تو پئیں۔ میرے خیال میں تو گرم ہو گیا ہو گا۔ بڑی دیر سے آیا رکھا ہے۔" اسماء کو ایک دم ہی خیال آیا بڑی دیر سے مشروب کا گلاس یونہی دھرا ہے تو اس نے کہا اور تیمور کا گلا بھی بولتے بولتے یا جھوٹے قصے گھڑتے گھڑتے خشک ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے خاموشی سے گلاس اٹھا لیا۔ باتوں ہی باتوں میں سہ پہر ڈھل گئی تھی اور دبیز پردوں سے مزین ڈرائنگ روم میں شام کا ساماں ہو رہا تھا۔
"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو آپ کی سہیلی کے یہاں چھوڑتا چلا جاؤں؟" وہ واپسی کے لیے پر تولتا ہوا بولا۔ جبکہ اسماء کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مزید کچھ دیر بیٹھے۔ وقت کی دھول کی دبیز تہوں میں چھپے ہوئے ماضی کو آہستہ آہستہ ابھار کر اس کے سامنے لاتا رہے۔
"نہیں' اب جانے کا وقت ہی کہاں رہا اور پھر جانا ایسا ضروری بھی نہیں' میں کل چلی جاؤں گی۔"
"چلیں جیسی آپ کی مرضی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر دونوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔
باہر جہاں دھیرے دھیرے اترتی سلونی شام میں شفق کے رنگ کائنات کی ہر شے میں سرائیت کر گئے تھے اور اسماء بھی شفق کے ان شنگرفی اور طلائی رنگوں میں ڈوبی اتنی اچھی' اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اسے خدا حافظ کہتے کہتے رک کر وہ پھر اسے تکنے لگا۔
انداز بھی کچھ عجب وارفتہ سا تھا کہ اسماء اس کی نظروں کی تپش سے گلابی سی پڑ گئی اور جلدی سے رخ پھیر لیا۔
"سوچتی ہوں گی کہ کیسا نامعقول سا کزن ہے جو اس قدر عامیانہ اور غیر شریفانہ انداز میں مجھے گھور گھور کر دیکھتا ہے یوں جیسے کبھی کسی لڑکی کو دیکھا ہی نہ ہو۔ مگر اب آپ کو یہ کیا معلوم کہ یہ نامعقول شخص خوب صورت چیزوں کا پرستار ہے یا خوب صورتی اس کی کمزوری ہے۔" اور پھر وہ اپنی بات کہتے کہتے اس کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
"مگر صرف ایسی خوب صورتی جیسی اس پیاری سی دل موہ لینے والی صورت میں ہے۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ اور پھر اس کے حسین تر چہرے کے ایک ایک نقش کو اپنی آنکھوں کی راہ دل میں اتارتا ہوا بولا۔
"میں نے جو عرصے سے تمہاری خوب صورتی کے متعلق ایک معیار قائم کر رکھا تھا تم اس سے بھی کہیں بڑھ کر حسین ثابت ہوئیں کہ آنکھیں تمہاری طرف

اٹھتی ہیں تو پھر جھکنا اور ہٹنا بھول جاتی ہیں اور یہ ایک بہت ہی غیر اختیاری عمل ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ بے حد جذباتی ہی نہیں انداز بھی بہت والہانہ تھا۔

وہ بے طرح دھڑکتے دل' شرم سے دہکتے ہوئے رخساروں اور جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ سحر زدہ سی کھڑی تھی۔

اس کی اکیس بائیس سالہ زندگی میں کبھی کسی مرد نے اس کے سامنے ایسی بے ساختگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

بلکہ اس نے تو کبھی بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ کوئی مرد اس کے ساتھ اس قدر جذباتیت کا مظاہرہ بھی کرے گا۔

اس کے باوجود اسے یہ سب عجیب بھی لگ رہا تھا اور اچھوتا بھی۔

کہ کچھ عمر کے تقاضے کی وجہ سے' کچھ دل کی پسندیدگی کے سبب' دل کے شبستانوں میں مسرت و انبساط کی کلیاں سی چٹک رہی تھیں' احساسات حد درجہ نازک سے ہو رہے تھے اور جذبات منتشر

جی چاہ رہا تھا جواب میں وہ بھی کچھ کہے۔ صرف اتنا ہی بتا دے کہ میں نے بھی تم سا خوب صورت' پرکشش اور دلربا سی شخصیت کا مرد پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور میں بھی خوب صورت چیزوں کی بڑی دلدادہ ہوں۔ مگر جو بالکل منفرد ہوں۔

لیکن کسی مرد سے کبھی اس کا واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

اور دل پسلیوں سے نکلا جا رہا تھا۔

حسین اور تروتازہ چہرے پر پسینے کی نمی کسی نودمیدہ گلاب پر شبنمی قطروں کی مانند چمک رہی تھی۔

شرم و حیا سے تمتمائے ہوئے رخساروں پر سایہ فگن گھنیری اور دراز پلکوں کی خفیف سی لرزش دل کے پاتال میں بڑی دور تک ایک تلاطم سا مچاتی لگ رہی تھی۔

اور چہرے پر پھیلے دلی مسرتوں اور الوہی خوشیوں کے رنگ' دل کی اتھل پتھل ہوتی کیفیتوں کے رنگ' پسندیدگی اور چاہت کی آنچ دیتے جذبوں کے رنگ'

احساسات کی بھڑکتی ہوئی چنگاریوں کے رنگ
رنگ ہی رنگ
ان گنت اور بیشمار رنگ
جن میں وہ ڈوبتا جا رہا تھا' غرق ہوتا جا رہا تھا'
ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا

سینے میں جذبات کی شوریدہ سری ایک حشر سا بپا کیے دے رہی تھی

مگر زبان گنگ تھی کہ لمحات' بڑے ماورائی' بڑے الوہی اور مقدس تھے کیونکہ ان میں دل کی اور جذبوں کی صداقتوں کے انمٹ' چوکھے اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے رنگ۔

اپنی پوری تابانی سے جھلک رہے تھے۔

اور ابھی چند لمحے پیشتر ہی اس نے اسماء سے کتنی خوب صورت اور احساسات کے تاروں کو جھنجھنا دینے والی باتیں کی تھیں۔

شہد آگیں اور الوہی پیار کی نغمگی کا نشہ اب بھی اسے مدہوش سا کیے تھا۔ نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں اور جذبوں کے ان گنت رنگ حسین تر چہرے پر جھلملا رہے تھے کہ وہ دو قدم آگے بڑھا اور بولا

"میں بن دیکھے اور بن جانے ہی مدت سے تم کو چاہتا چلا آ رہا ہوں اسماء! یہ سوچے اور سمجھے بغیر کہ کیا تم بھی میرے اس جذبے کی قدر کرو گی۔ میری محبت کا جواب محبت سے دو گی یا نفرت سے میں تم کو چاہے ہی چلا گیا۔ اصل میں میرے عہد طفولیت میں ہی میری ماں نے مجھے یہ بات ذہن نشین کرا دی تھی کہ میری شادی تم سے ہو گی یا بمعنی دیگر تم میرے لیے پیدا ہوئی ہو' میرا حق ہو' میری جاگیر ہو' ورنہ میں نے تو کبھی تمہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ لیکن جب اس روز پہلی بار دیکھا تو پہلی ہی نظر میں مجھے یوں لگا۔ جیسے مجھے اپنے خوب صورت اور سنہرے خوابوں کی تعبیر تمہاری صورت میں مل گئی ہو۔" پھر وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے سے لگا کر بولا۔

"اسماء! یہ آپس کی رنجشیں اور چپقلش سگے خونوں میں بھی فساد پیدا کر دیتی ہیں اور ہم خدا کے فضل سے تعلیم یافتہ اور باشعور ہیں۔ ہمیں اپنی ذاتی صلاحیتوں



سے کام لے کر ایسی مضرت رساں باتوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ خدارا اسماء! تم بھی ان باتوں کو بھول جاؤ جنہوں نے دو سگے بھائیوں کو ایسا جدا کیا تھا کہ وہ زندگی میں پھر کبھی نہ مل سکے اور میری محبت کا جواب دو' خواہ وہ نفرت ہی میں کیوں نہ ہو۔ لیکن خدارا سچ سچ اور بلا کسی لحاظ اور مروت کے بتا دو۔" اس کا لہجہ عاجزانہ سا تھا ملتجی سا تھا۔ اور محبت سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس سے جواب میں کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔

بس' بس رخساروں پر گری لرزتی کانپتی پلکیں اٹھیں۔

اور آنکھوں میں تیرتی ہلکی ہلکی نمی اور انداز خود سپردگی نے ہی تیمور کی ساری باتوں کا ایک مثبت سا جواب دے دیا۔ تو تیمور خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ وہ اس کی وارفتگی سے بچنے کے لیے بولی۔

"اب رات کا کھانا کھا کر ہی جایئے گا۔"

"نہیں بھئی' آج تو معاف ہی کر دو۔ آج میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکوں گا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ کہیں وہ روٹھ تو نہیں گیا۔ اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیوں کس وجہ سے نہیں کھا سکیں گے؟"

"اس وجہ سے کہ اگر تھوڑی سی دیر بھی یہاں ٹھہر گیا تو پھر۔" باقی بات اس نے اپنی آنکھوں سے کہی تو وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔

"او کے۔ چیرز اینڈ سو لانگ۔" وہ ہنستا ہوا بولا اور پھر اسی وقت چلا گیا اور وہ اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر رہ گئی۔

اف جانے کیسا نشہ پلا گیا تھا وہ کیسا فسوں پھونک گیا تھا کیسا سحر طاری کر گیا تھا کہ وہ اپنے ہوش و خرد کی دنیا میں نہیں رہی تھی۔

بس ہر وقت اسی کا تصور
اسی کا خیال
اسی کی ادائیں
اسی کی باتیں
اسی کی سحر کار شخصیت میں وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔

حتیٰ کہ یہ تک بھول گئی تھی کہ وہ اس کے مرحوم والدین کے متعلق کیا کیا انکشافات کر کے گیا ہے۔

یا آپس کی کشیدگی پر۔ انہیں ہی مورد الزام ٹھہرا کر گیا ہے۔

وہ تو بس۔۔۔ اس کی پیار بھری گفتگو میں ہی ہر دم ڈوبی نظر آتی۔

ہر روز بڑے اہتمام سے تیار ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی مگر وہ آیا پانچویں چھٹے روز ہی۔ وہ اس کے لاابالی پن پر دل ہی دل میں سخت شاکی ہو گئی تھی۔

وہ آیا تو وہ پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"اوہو کس بات پر خفا ہیں شہزادی عالیہ۔" وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پیار سے بولا۔

"نہیں بھلا مجھے خفا ہونے کا کیا حق پہنچتا ہے جو آپ سے خفا ہوں گی۔" وہ اس کے ہاتھوں کو آہستہ سے جھٹک کر بولی۔

"اوہو۔ تو گویا بڑی سنجیدگی سے خفا ہوئی ہو اور مجھے معلوم ہے کہ یہ خفگی کس سلسلے میں ہے۔ میرے اتنے دن نہ آ سکنے کی وجہ سے ہیں نا؟" وہ اسے منانے کی غرض سے اس کے بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھماتا ہوا بولا۔

"شکر ہے' آپ کو اتنا احساس تو ہوا۔" وہ طنز بھرے انداز میں بولی۔

"ہونہہ۔ آج تک تم نے ایک بار بھی یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ آئندہ کب آؤ گے۔ وہ تو میں خود ہی جب بے تابی دل حد سے بڑھ جاتی ہے کھنچا کھنچا چلا آتا ہوں۔" وہ قدرے تیکھے سے لہجے میں اس کے بازوؤں سے اپنے ہاتھ ہٹا کر بولا۔

بات اس نے بالکل درست کہی تھی وہ قائل اور خفیف سی ہو کر بولی۔

"لیکن کیا زبان سے کہنا ہی بہت ضروری ہوتا ہے؟ زبان ایک اور بھی ہوتی ہے اظہار تمنا کی۔ یعنی دل کی بھی تو ایک زبان ہوتی ہے۔ جو آنکھوں کو ترجمان بنا لیتی ہے۔" اس کا لہجہ بڑا چنچل سا تھا۔

وہ پلکیں جھپکا کر بولا۔

"اوہو۔ بہت باتیں بنانی آ گئی ہیں۔"

"آپ ہی کی فیضِ صحبت کا نتیجہ ہے۔ کرشمہ ہے۔" وہ اتنے شوخی بھرے پیارے انداز میں بولی کہ وہ نثار ہو گیا۔ اور تبھی رفیقا ٹرے تھامے اندر آگیا تو وہ جلدی سے اس کے پاس سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیوں جی کیا تیار رکھتے ہو پہلے سے ہمارے لیے یہ چیزیں۔" وہ پہلی بار بہت خوش دلی سے رفیقے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں جی ہر و یلے۔" رفیقے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا اور پھر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

"بھئی یہاں اسے گھٹے گھٹے ماحول میں بیٹھ کر کچھ پینا تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے رات کو سوتے سوتے پیاس لگ جائے۔ تو انسان اٹھ کر پانی پی لے۔" اس نے گلاس اٹھانے سے پہلے کہا۔

"تو پھر چلیے لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے پیش کش کی۔

"اونہوں۔ بلکہ کسی کولڈ اسپاٹ پر چل کر کچھ کھائیں پئیں تو بات بھی ہو۔ تھوڑی سی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔"

"آؤٹنگ؟ نہیں نہیں۔ بس لان تک ہی ٹھیک ہے۔"

"کیوں کیا میرا اعتبار نہیں؟"

"کمال ہے' آپ کا اعتبار نہ ہو گا مجھے!"

"اچھا اچھا سمجھ گیا۔ ٹیکسی وغیرہ میں جانا پسند نہ کرتی ہو گی مگر بھئی ہم تو مزدور آدمی ہیں۔ پیدل یا کرائے کی سواری میں ہی چل سکتے ہیں۔"

"اوہ نہیں نہیں۔ رکشہ یا ٹیکسی کا کیا سوال میرے پاس تو کار بھی موجود ہے مگر میں ہمیشہ کرائے کی سواری میں آتی جاتی ہوں۔ اصل میں ابو کے انتقال کے بعد کوئی چلانے والا نہیں رہا۔ تو وہ گیراج میں ہی بند پڑی ہے۔"

اور اس انکشاف پر ایک دم ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جنہیں جھکا کر وہ بولا۔

"بھئی واہ عجب شے ہو۔ گھر میں ذاتی سواری ہوتے ہوئے بھی کرائے کی سواری میں سفر کرتی ہو۔ کیا تم کو ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"نہیں ــــ ابو کی زندگی میں سیکھی تو تھی مگر اب بھول بھال گئی۔"

"تو پھر دوبارہ سیکھ لو نا یار! ورنہ وہ تمہاری گاڑی کو گیراج میں پڑے پڑے زنگ لگ جائے گا۔ انجن وغیرہ بھی جیم ہو کر رہ جائے گا۔"

"ہوں کہہ تو آپ ٹھیک ہی رہے ہیں۔" اسماء نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر اٹھی اپنی الماری کھولی اور اس میں سے کار کی چابی نکال کر اس کی طرف پلٹی۔

"لیجیے یہ چابی سنبھالیے گاڑی کی۔" وہ کار کی چابی اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"چابی سنبھالوں۔ مگر دو برس سے گیراج میں کھڑی گاڑی کا انجن تو جیم ہی ہو کر رہ گیا ہو گا۔" اس نے چابی لینے سے پہلے کہا۔

"جی نہیں ــــ یہ چابی آپ کو اس لیے نہیں دی جا رہی کہ آپ اسے ابھی اور اسی وقت کار کی اگنیشن میں لگا دیں بلکہ یہ اس لیے دی جا رہی ہے کہ اب کار آپ کے تصرف میں رہے گی۔"

"میرا؟ ــــ میرے تصرف میں رہے گی۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہاری چیز تمہیں ہی مبارک ہو۔" وہ اس کے ہاتھ سے چابی لیتے لیتے ہاتھ کھینچ کر بولا۔

"اچھا تو میری اور آپ کی چیزیں اب علیحدہ علیحدہ بھی ہونے لگیں۔" وہ برا مان کر بولی۔

"ارے نہیں' میری تو ہر شے تمہاری ہے۔ بلکہ میں سالم کا سالم تمہارا ہی ہوں۔"

"جی ہاں ضرور۔ تب ہی تو یہ غیریت برتی جا رہی ہے اور اس پر کہتے ہیں کہ سگے ہیں ــــ اپنے ہیں۔" وہ سر کو جھٹک کر بولی۔

"اوہ۔ نہیں نہیں جانم۔ اچھا ٹھیک ہے میں گاڑی کو اپنے تصرف میں لے لوں گا۔ اب تو خوش؟"

"جی ہاں بہت زیادہ سچ مجھے تو یہ سوچ سوچ کر رنج ہو رہا ہے کہ اتنے دن سے مجھے خیال کیوں نہیں آیا آپ کی تکلیف کا۔ میں نے آپ کو گاڑی کیوں نہیں دے دی۔"



وہ تاسف بھرے انداز میں بولی اور پھر چابی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "اسماء کی طرف سے ملک اور جواد کو ایک حقیر سا نذرانہ۔"

"ہیں ہیں ــــ یہ سخت زیادتی ہے جانم۔" وہ چابی کو مٹھی میں بھینچ کر بڑے احتجاجی لہجے میں بولا۔

"پھر وہی غیریت۔ آخر آپ بھی تو ابو کے بھتیجے ہیں اور بھتیجے اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو۔"

"ارے ارے بھائی کی مثال نہ دو ورنہ ہمارا رشتہ خطرے میں پڑ جائے گا۔"

اس نے کچھ اس طرح اچک کر کہا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر وہ مزید کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا اور دو روز تک غائب رہا۔ تیسرے دن آیا بھی تو ایسے وقت جب وہ کالج گئی ہوئی تھی۔ وہ ایک موٹر مکینک بھی ساتھ لایا تھا۔ اس نے رفیقے سے گیراج کھلوا کر گاڑی نکالی اور مکینک سمیت گاڑی لے کر چلا گیا۔

یہ نئے ماڈل کی اوپل ریکارڈ تھی۔

اس کے سامنے رفیقے کچھ کہنے کی جرات تو نہیں کر سکا تھا مگر اسے اس کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری تھی۔ اس نے آتے ہی اسماء سے اس کی شکایت کی تو اس نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

"تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں رفیقے بابا! میں نے ہی انہیں چابی دی تھی کہ وہ کار لے جائیں۔" تو رفیقے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

پھر وہ تیسرے روز ہی آگیا اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے چونکنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں خوب یاد آیا۔ یہ امی کا خط کل کی ڈاک سے آیا ہے ذرا ملاحظہ ہو اس میں انہوں نے کیا کیا لکھ ڈالا ہے۔" اتنی بات کہتے کہتے اس نے جیب سے خط نکالا اور اسماء کی طرف بڑھاتے ہوئے بہت ہنس کر کہا۔

اسماء نے بڑے اشتیاق سے وہ خط کھول کر پڑھا ناصرہ بیگم نے اپنے خط میں ایک بار نہیں دسیوں بار تیمور کو یہی تاکید کی تھی کہ وہ ان کی بچی یعنی اسماء کا پورا پورا خیال رکھے اور کسی طرح اسے کراچی لا کر ان سے ملوا دے اور اس کے علاوہ بھی انہوں نے اسماء کو اتنی دعائیں دی تھیں کہ خط پڑھ کر وفورِ جذبات سے اسماء کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ہاں' دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے' تائی اماں سے ملنے کو مگر آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ میرا فائنل ایئر ہے اور اگزیمز میں صرف چند ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں۔" وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

"مگر امتحانات میں تو ابھی پانچ ماہ باقی ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ امتحان کا آخری پرچہ دیتے ہی میں کراچی روانہ ہو جاؤں گی۔" وہ اس کی بے تابی پر مسکرا کر بولی۔

"اچھا۔ مگر ایک شرط پر۔"

"کیسی شرط؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اگزیمز کے بعد آپ مستقل طور پر وہاں رہنے کا تہیہ کر کے چلیں گی۔"

"مستقل طور پر؟ مگر یہاں کون رہے گا؟"

"رفیقے اور موداں۔"

"نہیں نہیں' یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں تیمور۔ اس گھر کے علاوہ میں کہیں رہنے کی عادی ہی نہیں ہوں۔ اس گھر کے چپے چپے پر میرے والدین کی یادیں ثبت ہیں۔ میں اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ البتہ اتنا ضرور کر سکتی ہوں کہ کچھ دن کے لیے آپ کے یہاں رہ آؤں۔ مگر مستقل طور پر رہنا تو مشکل ہی ہے۔" اور اس کے جواب پر اندر ہی اندر تیمور تلملا کر رہ گیا۔ اس کے باوجود بھی اس نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"بھئی' تمہاری یہ ضد سراسر بے جا ہے کیونکہ اول تو دستورِ زمانہ کے مطابق دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہمیشہ اپنے والدین کے پاس یا ان کے گھر میں نہیں رہتی دوسرے جب تم امی جان کی بہو بنو گی تو اس صورت میں تو یہاں رہ ہی نہیں سکو گی۔" اس کے منہ سے بہو کا لفظ سن کر وہ لجا سی گئی۔

"نہیں رہ کیوں نہیں سکوں گی بشرطیکہ آپ یہاں میرے ساتھ رہنا پسند کریں ویسے آپ سروس بھی تو یہیں کرتے ہیں نا؟" اس نے شرمائے شرمائے انداز میں کہا۔

"تو ہیل ود مائی بلڈی سروس۔ بس تمہاری ساری گفتگو کا مقصد صرف یہی ہے کہ تم ہمارے گھر رہنا نہیں چاہتیں۔ کیونکہ تم کو اپنی والدہ کی طرح ہم پر اعتماد نہیں ہے اور نہ تمہارا دل ہماری طرف سے صاف ہی ہوا ہے۔" وہ آخر بھڑک ہی اٹھا۔

"اف۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تیمور! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں لیکن میں آپ کو بتادوں کہ میں تو غیروں سے بھی دل میں منافقت رکھ کر ملنا پسند نہیں کرتی۔ آپ کی تو بات ہی دوسری ہے اور مجھے تو سارا زعم' سارا مان آپ ہی کی ذات پر ہے۔ ویسے بھی میں نے کون سی ایسی بے جا بات کہہ دی۔ جب آپ سروس یہیں کریں گے تو ظاہر ہے یہیں رہنا بھی پڑے گا۔" وہ بہت وضاحت کے ساتھ اپنی صفائی پیش کرتی ہوئی بولی۔

"لیکن اول تو میں نے اس سروس کے لیے عمر پٹہ نہیں لکھوایا نہ معلوم کب تک رہے دوسرے یہ بھی بعید نہیں کہ کس وقت کہاں کا ٹرانسفر کر دیا جائے۔ آج کل کمپنی میں یہی مسئلہ زیر غور ہے کہ میرا تبادلہ کس شہر میں کیا جائے۔"

"ہائے تو آپ وہاں سے چلے جائیں گے؟"

"ہاں اور آپ مزے سے اس گھر میں موج اڑایئے گا۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولا۔

"لیکن آپ کو میری مجبوری کا تو علم ہے۔ وہ اسٹڈیز۔"

"درسگاہیں اور کالجز تو وہاں بھی موجود ہیں اور کافی تعداد میں ہیں۔ رہا یہ گھر نہ چھوڑ سکنے کا عذر تو اس کا حل پیش کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اور پھر میں آپ کو مجبور تو نہیں کر رہا۔ جو آپ یہ صفائیاں پیش کر رہی ہیں۔" وہ اٹھتا ہوا سخت ناگواری سے بولا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسماء نے کتنا چاہا بھی کہ اسے منالے مگر خود داری آڑے آگئی۔ اصل میں اس کے یہاں جا کر مستقل طور پر رہنے کا مسئلہ ہی ایسا پیچیدہ تھا کہ وہ کوئی مثبت جواب دے کر اس کی ناراضگی دور نہیں کر سکتی تھی۔

وہ خفا ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے پندرہ دن تک غائب رہا تھا اور یہ پندرہ دن اسماء نے جس بے چینی' جس کرب اور اذیت میں گزارے تھے اس کا ہی دل جانتا تھا۔ اس کے سمسٹر ہونے والے تھے۔ مگر اس کا دل پڑھائی میں بھی نہیں لگ رہا تھا حتیٰ کہ کالج جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ اس کی غیر حاضری میں نہ آجائے اور اس سے ملے بغیر ہی چلا جائے۔

صفیہ آنٹی کے ہاں بھی اس نے آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ صفیہ آنٹی اب بھی تیمور کی طرف سے مطمئن نہیں تھیں اور اسے کار بخش دینے کی حرکت پر اسماء کو کافی نصیحتیں کر چکی تھیں۔

پھر ایک روز شام کو جب وہ بڑی بے دلی سے اپنے نصاب کی کتابیں لے کر بیٹھی تو وہ آگیا۔

"ہیلو کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آتے ہی بڑے شگفتہ موڈ میں پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے' کیسی ہو؟" وہ تھوڑا سا مسکرا کر بولا۔

"جیسی بھی ہوں' آپ کو اس سے مطلب ــــ آپ خود تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟"

"ہاں۔ ایک دم ٹھیک ٹھاک۔ لیکن یہ آپ کے رخ انور پر اتنی زیادہ صحت مندی کے آثار کیسے نظر آرہے ہیں۔" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"آپ کی اتنے دن کی غیر حاضری کی وجہ سے آخر آج بھی کیوں آنے کی زحمت گوارا کی آپ نے۔" وہ اپنے اتنے دن کی انتظار کی کوفت گویا اس پر اتارتی ہوئی بولی۔

"اوہو تو اس ناراضی کی بنا اور مخاصمت ہمارے اتنے دن کی غیر حاضری ہے۔ لیکن بھئی ہمیں خود کب چین پڑتا ہے تمہیں دیکھے بنا۔ مگر کیا کریں مصروفیت



ہی ایسی تھی کہ سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ اس پر یہ کمبخت ہمارے افسران مجھے سرگودھا بھیجنے پر تلے ہوئے تھے جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔ بس اس عرصہ میں سر توڑ کوشش کرتا رہا کہ میرا ٹرانسفر کراچی کا کر دیا جائے۔" اس نے اپنی مجبوری بیان کی تو یک لخت اس کی ساری کوفت مٹ گئی۔

"اچھا تو کیا انہوں نے آپ کا مطالبہ منظور کر لیا؟" اس کے ٹرانسفر کی خبر پر وہ ہراساں سی ہو کر بولی۔

"نہیں ابھی تو مسئلہ زیر غور ہے' لیکن امید واثق یہی ہے کہ جلد ہی منظور کر لیا جائے گا۔"

اوہ تو تیمور یہاں سے چلے جائیں گے' اس خیال سے اسے اپنا دل ڈوبتا سا لگا جبکہ تیمور کو ذرا سی بھی پروا نہ تھی بلکہ کراچی جانے کے خیال سے وہ بہت خوش نظر آرہا تھا اور یہ بات اسماء کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اس سے کہے کہ تم ابھی اپنا ٹرانسفر نہ کراؤ۔ بلکہ یہیں رہنے کی کوشش کرو کیونکہ تم چلے جاؤ گے تو میں بالکل تنہا رہ جاؤں گی یا بالفاظ دیگر تمہارے بنا میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ مگر یہ سب کہنا اسماء کو خوشامد ہی لگا اور پھر خود تیمور نے ہی موضوع بدل دیا تھا۔ وہ اسے منانے اور بہلانے کے لیے بڑی پرلطف اور پرمزاح باتیں کر رہا تھا کہ آزردہ اور رنجیدہ ہونے کے باوجود وہ بے ساختگی سے ہنسے جا رہی تھی۔ پھر جب وہ واپسی کے ارادے سے اٹھا تو جانے کچھ یاد کر کے کوٹ کی جیب میں اڑسا ہوا شام میں شائع ہونے والے کسی اخبار کا ایک صفحہ نکال کر اس نے اسماء سے کہا۔

"آج کل ایسا کیا کرو کہ رفیقہ کو دن میں سلایا کرو اور رات کو اس سے چوکسی کرایا کرو اور خود بھی ذرا ہوشیار ہو کر سویا کرو۔"

"کیوں خیریت تو ہے۔" وہ اس کی کرو کرو کی گردان پر مسکرا کر بولی۔

"ہاں ہے بھی اور نہیں بھی۔ کیونکہ آج کل شہر میں بڑی ڈکیتیاں پڑ رہی ہیں۔"

پھر اس نے اخبار کا وہ صفحہ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"لو دیکھ لو' اس اخبار میں ایک نہ دو بلکہ ایک ہی رات میں پانچ پانچ ڈکیتیوں کی خبر شائع ہوئی ہے اور جب سے یہ خبر پڑھی ہے میں تمہاری طرف سے سخت فکر مند ہوں۔"

"اوہ۔" اس نے تشکر آمیز اور محبت پاش نظروں سے تیمور کی طرف دیکھ کر دل میں سوچا کہ تیمور کو اس کا کتنا خیال ہے۔

"ہاں اور بعض علاقوں میں تو دن دہاڑے بھی ڈاکہ پڑا ہے۔" اس نے مزید بتایا۔

"تو پھر ایسا کریں نا کہ کچھ روز کے لیے یہاں آجایئے۔" اسماء خود بھی متفکر سی بولی۔

"ہاں ضرور۔ تاکہ یہ تمہارے گھٹیا سے محلے والے جو میرے تھوڑی دیر کے لیے آنے پر اس قدر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ تمہیں بالکل ہی بدنام کر کے رکھ دیں اور پھر اپنا بھی کچھ بھروسا نہیں۔ تم تو اپنی ان قاتل اداؤں سے ویسے ہی ایمان متزلزل کر کے رکھ دیتی ہو۔" آخری فقرہ اس نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ کٹ کر رہ گئی۔

"اف بڑے وہ ہیں آپ۔" اس نے شرما کر کہا۔ "ورنہ میں تو صرف چوروں کے خدشے سے کہہ رہی تھی۔"

"ارے نہیں' اب اس قدر پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں' وہ تو میں نے احتیاط کے طور پر کہہ دیا تھا ورنہ یہ تو شہر کا گنجان علاقہ ہے اور وارداتیں شہر کے اطراف اور سنسان علاقوں میں ہو رہی ہیں۔" وہ اسے متفکر سا دیکھ کر اطمینان دلاتا ہوا بولا۔ "اصل میں یہ ٹی وی پر جو ویسٹرن موویز میں چوروں اور دھاڑیوں کو چوری کرنے کے نئے نئے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ تا یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کے چوروں اور ڈاکوؤں نے بھی چوری کرنے کے جدید اور سائنسی طریقے اختیار کر لیے ہیں۔ لو دیکھو' ایک جگہ کوئی محلول ڈال کر چوروں نے گرل اور تالے گلا دیئے اور ایک جگہ بجلی کا سرکٹ اڑا کر خطرے کے سائرن کو ناکارہ بنا دیا۔ بہرحال افسوس ہوتا ہے اپنی قوم پر کہ ترقی کرنے کے بجائے تنزلی کی طرف جا رہی ہے۔" وہ

تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ "اصل میں ہم لوگ ابھی تک اپنے مذہب کو نہیں سمجھے جب سمجھ جائیں گے تو خود ہی معاشرے کی یہ ساری خرابیاں اور خامیاں دور ہو جائیں گی۔" اسماء نے کہا جبکہ اس کے دماغ میں اس سمے چوروں اور ڈاکوؤں کا بھیانک تصور ہی گردش کر رہا تھا۔

اس نے پھر اخبار کی سطور پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اف! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت بالکل دم توڑ چکی ہے کمبخت چوری ہی کرنے کی نیت سے آتے ہیں تو بلا سے' سارا گھر صاف کر کے لے جایا کریں مگر وہاں تو ظلم و بربریت کی انتہا بھی کر دیتے ہیں اب یہ دیکھو ایک گھر میں گھس کر ڈاکوؤں نے گھر کے مکینوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور ایک جگہ مردوں کو شوٹ کر دیا اور عورتوں کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر انہیں رسیوں سے جکڑ دیا اور اس پر بھی بس نہ چلا تو گھر لوٹنے کے بعد جاتے جاتے گھر کو آگ بھی لگا گئے اور ـــ اور اف توبہ توبہ! ایک جگہ تو درندگی کی حد ہی گزار دی۔ کسی عورت نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہا کہ ساری چیزیں حاضر ہیں تم لوگ وہ سب لے جاؤ اور میری جان بخشی کر دو۔ مگران بھیڑیا صفت چوروں نے نہ صرف اس کی بے حرمتی کی بلکہ جاتے جاتے اس کی آنکھیں بھی جلا گئے۔ اف خدا کی پناہ بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ اور مہذب دور میں اس قدر ظلم اور بربریت' سچ میرا بس چلے تو ایسے مردہ ضمیر لوگوں کو چن چن کر سولی پر چڑھا دوں۔" وہ اخبار میں چوری کی خبریں پڑھ پڑھ کر اسے سنانے کے ساتھ ساتھ رنج و افسوس کا اظہار کرتا رہا اور ڈر کے مارے اس کے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے حلق میں بھی جیسے کسی نے ریت سی بھر دی۔

"خیر فکر کی کوئی بات نہیں جانم ادھر چونکہ گنجان آبادی ہے اس لیے چوری کا کوئی امکان ہی نہیں لیکن اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی واردات ہو بھی جائے تو سب سے پہلے تم ایسا کرنا کہ فوراً" ہی کمرے سے باہر نکل کر کسی ایسی جگہ چھپ جانا کہ کوئی تمہیں دیکھ ہی نہ سکے ورنہ اگر کسی کی نظروں میں آ گئیں تو ـ تو اف توبہ میں بھی کن توہمات میں پڑ گیا۔ اصل میں کوئی غیر معمولی بات یا حادثہ وقوع پذیر ہو جائے تو سب سے پہلے اپنوں کا ہی خیال آتا ہے ورنہ بات کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ اسماء کا خون خشک کرنے کے بعد پھر اسے دلاسا دیتا ہوا بولا مگر اسماء پر جو حد درجہ خوفزدہ ہو گئی تھی اس کے تسلی دلاسوں کا کوئی اثر نہیں ہوا حتیٰ کہ اس روز وہ رات کا کھانا کھا کر گیا تھا اور اس عرصے میں اسماء سے جو جو باتیں بھی کرتا رہا تھا۔ اسماء نے اپنی پریشانی اور خوف میں ان پر دھیان ہی نہیں دیا تھا اور جب وہ اسے خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو اسماء کا دل چاہا اس سے لپٹ جائے اور رو رو کر کہے کہ تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ ڈر کے مارے میرا دم نکل رہا ہے مگر وہ بھی ملکوں کی بیٹی تھی اور اس کے سامنے اس طرح اپنی کمزوری کا اظہار کرنا اس کے لیے بڑی ذلت کی بات ہوتی۔ پھر وہ رات ہی نہیں بلکہ کئی راتیں موداں اور رفیقے نے جاگ جاگ کر آنکھوں میں کاٹیں بس ہر لحہ اور ہر دم ڈاکوؤں کی آمد کا انتظار رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خون بھی خشک رہتا تھا۔ رفیقے کو پتہ چل گیا تھا اس لیے یہ بات سارے محلے میں مشہور ہو گئی تھی۔

صفیہ بیگم بھی تھوڑی سی خائف ہو گئی تھیں کیونکہ ان کے انڈسٹریل ہوم میں جو ان کے گھر سے ملحق ہی تھا۔ بہت مال مسالہ بھرا ہوا تھا اور سیف میں روپیہ بھی کیونکہ زیورات تو وہ لاکر میں ہی رکھتی تھیں۔

وعدہ کرنے کے باوجود تیمور کئی روز سے نہیں آیا تھا۔ تقریباً" ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا اور اسماء جل جل کر سوچی کہ عجب بے تکے انسان ہیں یا تو میری طرف سے اس قدر پریشان اور فکر مند ہو رہے تھے یا اب لاپروائی کا یہ عالم ہے کہ ایک ہفتہ ہونے کو آیا پلٹ کر میری خبر تک نہیں لی۔ خیر اب کے آئیں گے تو ان کا پتا معلوم کیے بغیر نہ رہوں گی اور چونکہ اتنے روز سے کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اس لیے چور ڈاکوؤں کی طرف سے بے فکر سی ہو گئی تھی اور اس رات اول رات ہی سے لمبی تان کر سوئی تھی کہ دو بجے کے قریب



کسی عجیب سے احساس سے یکلخت اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید اندر صحن میں کوئی چور کودا تھا۔ اس نے لرز کر دل میں سوچا اور تب ہی تیمور کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

خدانخواستہ کوئی ایسا ہی خطرہ درپیش آ جائے تو کمرے سے نکل کر کسی ایسی جگہ چھپ جانا جہاں تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ ورنہ نظروں میں آ گئیں تو ـــ" اف مارے خوف و دہشت کے اسے اپنا خون منجمد سا ہوتا لگا۔ دل بھی پسلیاں توڑ کر باہر نکلتا محسوس ہوا۔ ٹانگیں بھی جکڑ سی گئیں اور ہاتھ پیروں میں رعشہ سا پڑنے لگا۔ کیونکہ یہ جان سے کہیں بڑھ کر عزیز شے عزت کا سوال تھا۔ حواس اور قویٰ ساتھ تو نہیں دے رہے تھے اس کے باوجود بھی اپنی تمام تر قوت یکجا کر کے وہ سلکن چادر جو وہ اوڑھے ہوئی تھی۔ اسے پھینک کر پھرتی سے اٹھی اور بھاگ کر کمرے سے نکلنا ہی چاہ رہی تھی کہ ایک ڈاکو سر تا پا سیاہ چمڑے کے لباس میں ملبوس' چہرے پر ماسک چڑھائے اندر آ گیا۔ اف' اس قدر قد آور تھا کہ اسماء کو اس پر جن کا گمان ہونے لگا۔ وہ جہاں تک آ سکی ـــ تھی وہیں منجمد ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ وہ سیدھا اس کی طرف ہی بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ کمرے میں روشن زیرو پائنٹ کے نیلے بلب کی روشنی میں اسماء نے اپنی خوف و دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی نظریں اس کے جسم پر ٹکی تھیں۔

"اف اللہ! اب یہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر میرا گلا گھونٹے گا یا پھر میری عزت پر ہاتھ ڈالے گا۔" اس خیال کے آتے ہی اس کے ہوش و حواس نے بالکل ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر جونہی چور نے اس کے قریب آ کر اس کے بازو کو اپنے آہنی پنجے میں جکڑا وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ پھر اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

ہوش آیا تو صفیہ بیگم سمیت موداں' رفعت نادیہ کی والدہ اور کئی پڑوسنیں اسے اپنے بیڈ کے اردگرد کھڑی اور بیٹھی نظر آئیں۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ یہی سمجھی کہ وہ رحلت کر گئی ہے اور یہ سب کے سب لٹکے پریشان اور ماتمی چہرے لیے اس کے اردگرد کھڑے ہیں اس نے ڈر کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ارے اسماء ـــ اسماء! سنو بیٹی تم ہوش میں تو ہو نا؟" صفیہ بیگم نے اسے آنکھیں کھول کر بند کرتے دیکھا تو ہلا ہی ڈالا اور ان کے ساتھ دوسری خواتین بھی اسے ہلانے اور پکارنے لگیں۔ تب کہیں جا کر اسے یقین آیا کہ بفضل تعالیٰ وہ بقید حیات ہے۔ تو اس نے پٹ سے پھر آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں کھولتے ہی رات کا منظر اس کی نظروں میں گھوما تو اس نے صفیہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر پھکوں ـــ پھکوں رونا شروع کر دیا۔

"ہے ہے بیچاری کے ساتھ نہ معلوم کیا واقعات پیش آئے اس بدبخت چور نے کیسا سلوک کیا۔ سنا ہے کمرے میں اکیلی تھی۔" اس کی اتنی شدید گریہ و زاری پر رفعت نے اپنی گندی ذہنیت کے مطابق اپنے خدشات کا اظہار کیا تو رفیقے جو پیچھے ہی کہیں کھڑا تھا جلدی سے بولا۔

"نئیں جی ـــ بی بی کو ـــ اس نے چھوا تک نئیں۔ جیسے ہی اس نے بی بی دے کمرے وچ قدم رکھیا میں ڈنڈا پھڑ کے اس پر دوڑ' چڑھیا۔ چور میں نوں دیکھتے ہی کھڑکی لنگھ کے کود گیا سی!"

"آہو۔ جس ویلے میں اندر آئی تے چور کھڑکی لنگھ کے نس گیا سی ہور بی بی ایتھوں قالین پر بے ہوش پئی سی۔" موداں نے بھی گویا یہ کہہ کر رفیقے کی بات کی تصدیق کر دی تو صفیہ بیگم نے بڑے ملامت آمیز لہجے میں رفعت سے کہا۔

"آپ بھی کیسی واہیات باتیں سوچتی ہیں رفعت! کچھ تو خدا کا خوف کر لیا کریں۔"

"ہاں ہاں۔ بھئی چور چوری کی نیت سے ہی آتے ہیں کسی اور نیت سے نہیں پہلے یہ تو دیکھو کہ وہ کچھ چرا کر تو نہیں لے گیا؟" نادیہ کی امی بولیں جنہیں رفعت کے خدشات بہت گراں گزرے تھے تو شرمندہ ہونے کے بجائے برا مان کر اسی وقت اپنے گھر چلی گئیں اور پھر صفیہ بیگم سمیت موداں اور رفیقے نے گھر کی ایک ایک چیز دیکھ ڈالی۔ مگر ہر چیز صحیح سلامت ہی ملی۔ چور کو

موقع ہی کہاں ملا کچھ چرانے ورانے کا۔ اب نہ معلوم وہ تنہا تھا یا اس کے گروہ کے آدمی بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ تو عین وقت پر جاگ ہو گئی تو وہ بھاگ بھوگ گئے تھے۔ مگر اس واقعہ کے بعد اسماء اس قدر خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ دو روز تک تو اسے تیز بخار چڑھا رہا اور اپنے کمرے میں بھی اس نے سونا چھوڑ دیا تھا اور موداں اور صفیہ کے ساتھ اپنے ابو امی کے کمرے میں سونے لگی تھی اور تیمور کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی مگر وہ اس واقعے کے پانچ روز بعد ہی آیا۔

"اوہو۔ بھئی خیریت تو ہے یہ تمہیں کیا ہوا؟" اس نے آتے ہی اسے بیمار سا دیکھ کر بڑی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ جواب میں ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی تو وہ ہراساں سا ہو کر بولا۔

"ہائیں۔۔۔ یہ برکھارت کس سلسلے۔ اب کے تو میں اتنی تاخیر سے بھی نہیں آیا۔"

"تاخیر تو ایک گھنٹے کی بھی ہوتی ہے کہاں ۔۔ دس گیارہ دن کی۔" وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔

"اوہ۔ سوری جان۔ واقعی بہت تاخیر ہو گئی۔ لیکن تم نے یہ کیا حال بنا لیا اپنا۔" وہ معذرتی سے لہجے میں بولا۔

"وہ۔۔۔ وہی چور ابھی چار دن پہلے دو بجے رات کو کودا تھا۔" اس نے رقت بھری آواز میں اٹک اٹک کر بتایا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"ہیں۔۔۔ چور کودا تھا۔ یہاں تمہارے گھر میں۔ اس نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟" اس نے سخت پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہیں اسے کچھ چرانے کا موقع ہی نہ ملا۔ جاگ ہو گئی تھی نا۔ جونہی وہ میرے کمرے میں آیا رفیقے کا کا ڈنڈا لے کر اسے مارنے دوڑا۔ تو وہ ڈر کر کھڑکی سے کود کر بھاگ پڑا۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"اچھا' اچھا تو پھر اس میں اس قدر رونے دھونے کی کیا بات ہے جب کوئی نقصان ہی نہیں ہوا۔ تم کو الٹا خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔

"مگر جو کچھ ہوا یہی کیا کم تھا۔ یعنی چور کا آنا۔ پتا بھی ہے میں ڈر کے مارے بیہوش ہو گئی تھی۔ دو روز تک تو مجھے بخار چڑھا رہا' جو کل ہی اترا ہے۔" وہ اس کی بات پر چڑ کر بولی۔

اور پھر اسے چور کے آنے اور پریشان اور خوفزدہ ہو جانے کی ساری تفصیل سنا کر نئے نئے اندیشوں میں گھر کر اس نے کہا۔

"اتنے اطمینان سے تو کہہ رہے ہیں لیکن شاید آپ کو یہ اندازہ نہیں کہ چوروں نے اب ہمارا گھر دیکھ لیا ہے ان کو یہ سب ہی اچھی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر وہ یہاں سے اپنی مہم میں ناکام ہو کر گئے ہیں۔ چنانچہ کوئی بعید نہیں کہ وہ کسی دن بھی پھر اسی گھر پر دھاوا بول دیں۔"

"ہاں یہ تو تم نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ اپنی ناکامی کا بدلہ ضرور لیں گے اور چوروں پر ہی کیا موقوف تمہارے رہنے میں تو اور بھی بہت سے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اب نہیں تو آئندہ کبھی یہ تمہارے پڑوسی اور ملنے ملانے والے بھی ضرور تمہاری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور یہ رفیقے بھی آخر کہاں تک تمہارا ساتھ دے سکے گا۔ جوان اور چھڑا آدمی ہے کبھی نہ کبھی تو یہ بھی اپنا گھر بسائے گا۔ زمانہ اتنا ترقی کر گیا ہے جان من کہ آج کل کے یہ نوکر چاکر بھی بہت اونچے خیالات رکھنے لگے ہیں۔ اب یہ اپنے آقاؤں کو گردانتے ہی نہیں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ اس کی ناصحانہ سی باتوں پر قائل سی ہو کر بولی۔

"مگر میں بھی کیا کروں۔ اس گھر سے کہیں جا سکتی ہوں نہ کسی کو مستقل طور پر اپنے پاس رکھ سکتی ہوں۔ موداں بھی بس عارضی طور پر ہی یہاں رہ رہی ہے اور صفیہ آنٹی اپنا گھر چھوڑ کر مستقل طور پر بھلا یہاں کیسے رہ سکتی ہیں۔"

"تو پھر تمہارے اس پرابلم کا واحد حل یہی ہے کہ اس گھر میں تالا ڈالو یا پھر اسے کرائے پر اٹھا دو اور



میرے ساتھ کراچی چلو۔ وہاں ماشاء اللہ ہم چاروں بہن بھائیوں اور ابو امی سمیت کئی کئی ملازم بھی موجود ہیں۔ ہر وقت ایک رونق سی لگی رہتی ہے۔ ویسے بھی کراچی میں جتنی رونق اور چہل پہل ہے پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں ہے۔ اسی لیے تو اسے عروس البلاد کہتے ہیں۔ کراچی واقعی' روشنیوں گاڑیوں اور بلند عمارتوں کا شہر ہے۔ ٹریفک کا ایک سیلاب ہوتا ہے جو دن رات کراچی کی تقریباً" تمام سڑکوں پر رواں دواں نظر آتا ہے۔"

وہ کہتا رہا اور وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی کہ مستقل طور پر کراچی جا کر رہنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

"ویسے بھی میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے اور میں جلد ہی یہاں سے جانے والا ہوں۔" اس نے اسے اپنی گفتگو سے متاثر دیکھ کر ایک اور شوشہ چھوڑا۔

"اچھا۔ کہاں کا ہوا ہے؟" اس نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

"کراچی کا ہی ہوا ہے اور کہاں کا ہوتا۔ میں نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آخر اپنا مطالبہ منوا ہی لیا۔" وہ بہت فخریہ اپنی کارکردگی کو جتاتا ہوا بولا۔

"تو کب تک چلے جائیں گے آپ۔؟" وہ اس کے انداز پر دل ہی دل میں آزردہ ہو کر بولی۔

"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے تک ورنہ چار پانچ روز بعد۔" اس نے بڑے مگن سے لہجے میں بتایا۔

"اف کراچی جانے پر اتنے خوش ہیں کہ مجھ سے بچھڑنے کا تھوڑا سا بھی ملال نہیں۔" اسماء دل گرفتہ ہو کر سوچتی رہ گئی۔

"بھئی' اپنی گاڑی کے بارے میں تو نہیں سوچ رہیں تم مگر اطمینان رکھو۔ وہ صرف میری روانگی تک ہی میرے پاس رہے گی پھر میں تمہاری امانت تمہیں ہی واپس کر جاؤں گا۔" اور اس کی بات پر اسماء نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے کچھ ایسی شاکی اور ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

"کیوں بھئی کیا میں نے حد ادب سے بڑھ کر کوئی بات کہہ دی ہے جو تم مجھے اس طرح گھور رہی ہو۔"

"آپ نے اس سے بھی کچھ زیادہ ہی گری ہوئی بات کہی ہے کیونکہ میں تھوک کر چاٹنے کی عادی نہیں ہوں۔" وہ بڑے درشت اور سخت سے لہجے میں بولی۔

"کک۔ کیا مطلب؟" اس نے ہکلا کر پوچھا۔

"مطلب یہی کہ وہ گاڑی میں نے آپ کی نذر کی تھی۔ اب خواہ آپ اسے اپنے پاس رکھیں یا توڑ پھوڑ کر پھینک دیں۔ میں اسے واپس نہیں لوں گی۔"

"او۔۔۔ نو۔۔۔ نو۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بجائے خود تمہیں کچھ دینے کے الٹا تم سے کچھ لوں۔ وہ بھی گاڑی۔"

"لیکن گاڑی کو آپ اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں کیا چیزیں اپنوں سے قیمتی اور عزیز ہوتی ہیں۔؟"

"نہیں۔ خیر اپنوں سے عزیز تو نہیں ہوتیں لیکن میں خود کو تمہارے اس قیمتی تحفے کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ کیا یہ معمولی سی دو ڈھائی لاکھ کی کار آپ سے زیادہ قیمتی ہے۔ میرا بس چلے تو اپنی جان بھی آپ پر سے نثار کر دوں۔" اس نے اس کی بات پر بے حد جذباتی ہو کر کہا۔ مگر اس کے ایک ایک لفظ سے صداقت ٹپک رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھی دل ہی دل میں اس کی محبت کا قائل ہو گیا۔

"اف' تم اس معاملے میں بھی مجھ سے بازی لے گئیں جبکہ یہ سب تو مجھے تم سے کہنا چاہیے تھا۔ خیر اب کچھ کہنا تو محض زبانی جمع خرچ ہی معلوم ہو گا البتہ کبھی کوئی موقع آیا تو عملی طور پر ثابت کر کے دکھا دیں گے کہ ہم تم پر خود کو کیسے نثار کرتے ہیں۔" جوش میں آ کر اس نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ۔۔۔ ضرور جب ہی تو یہ عالم ہے کہ کراچی جانے کی خوشی میں مجھ سے بچھڑنے کا ذرا سا ملال بھی نہیں اور دعوے اس قدر بلند بانگ کیے جا رہے ہیں۔" آخر وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے ہی آئی اور تب وہ کچھ دیر بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بڑی جانچتی سی نظریں تھیں جن میں کسی جذبے کا ہلکا سا پرتو بھی نہ تھا اور وہ سمجھی کہ وہ اس کی بات کا برا مان

گیا ہے اس لیے یوں گھور رہا ہے۔ وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کی مسکراہٹ بڑی معصوم، بڑی حسین اور دلنشین سی ہوتی تھی کم از کم تیمور تو ایک دم دیوانہ سا ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے وہ بالکل متاثر نہیں ہوا تھا۔

"کیا بات ہے بھئی۔ کیا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں بلکہ خود کو پہچاننا چاہ رہا ہوں۔ کیونکہ تم نے طعنہ ہی ایسا دیا ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔

"ارے نہیں۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا اور آپ سیریس ہی ہو گئے۔" اسے اس قدر سنجیدہ دیکھ کر اسماء نے بات بنائی۔

"نہیں، نہیں میں نے مائنڈ نہیں کیا تمہاری کسی بات کو سویٹ ہارٹ۔"

اس نے ایک دم ہی گویا پینترا بدل کر کہا اور پھر گھٹنوں کے بل اس کے آگے بیٹھ کر بولا۔

"تمہیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں جانم کہ تم سے بچھڑ کر میں ایک پل بھی چین سے نہ رہ سکوں گا۔ یہاں رہتا تھا تو یہاں یہ تو اطمینان تھا کہ تم بھی اسی شہر میں رہتی ہو۔ جب چاہوں گا تمہارے اس چاند سے مکھڑے کا دیدار کر لوں گا مگر اب بہت مجبوراً کہ محکمے والے کہیں نہ کہیں میرا تبادلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے کوشش کر کے کراچی جا رہا ہوں تو اندر سے ٹوٹ پھوٹ سا گیا ہوں۔ یہ سوچ سوچ کہ تم بن کیسے جی سکوں گا۔" وہ جو اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اس سے بالکل لگا بیٹھا حال دل سنا رہا تھا اس نے اپنی بات کہہ کر اس سادہ لوح معصوم اور ناتجربہ کار کو اپنی گفتگو کے سحر میں جکڑ کر کہا۔

"سنو میری جان ۔۔۔ میری روح! اب تو میری بات مان لو اور یہ سارے جھمیلے چھوڑ کر میرے ساتھ کراچی چلی چلو۔ پلیز اسماء تم اپنے ذہن اور خیالات کو تھوڑی سی تو وسعت دو۔ یہ گھر تمہاری ذاتی ملکیت ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی زندگی کی ساری لطافتوں سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ گھر سے قدم ہی باہر نہ نکالو۔ اچھا یہی سوچو کہ اگر میں تم سے نہ ملا ہوتا اور تمہاری شادی کسی اور کے ساتھ ہو گئی ہوتی تو کیا تم اس پر بھی اس گھر کو ترجیح دیتیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر وہ تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تو کیا تم انکار کر دیتیں یا اسے چھوڑ دیتیں ویسے بھی جان تمنا! لڑکیاں کب ساری عمر اپنے والدین کے گھروں میں رہتی ہیں کیونکہ ان کا اصل گھر تو ان کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے اور تم بھی کب تک یہاں رہ سکو گی۔ دیکھو نا یہ تو دستور دنیا ہے اور میں تمہیں مجبور تو نہیں کر رہا البتہ اتنا ضرور پوچھوں گا کہ کیا تم میرے بغیر چین سے رہ سکو گی اور کیا تنہا رہ کر اپنی پوری پوری حفاظت بھی کر سکو گی۔"

اف بڑے پیار سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر یہ سب کہنے کا انداز کس قدر عاجزانہ ملتجی اور دلنشین سا تھا۔ اس پر اپنی روشن روشن سی آنکھوں میں بیم ورجا کی سی کیفیت لیے ڈارک براؤن پینٹ پر کریم چیک کی شرٹ پہنے اپنے وجیہہ چہرے پر ایک سوز اور دلی جذبوں کی تپش لیے ۔۔۔ کھلے ہوئے گریبان سے جھانکتی روئیدگی کے ساتھ وہ اسے اتنا پیارا، اتنا اچھا لگا کہ اگر اس کے وہ اس سے یہ کہتا کہ ابھی ابھی چل کر میرے ساتھ نکاح پڑھوا لو۔ تو وہ کسی معمول کی طرح چپ چاپ اس کے ساتھ نکاح پڑھوانے چل دیتی۔ کجا کہ یہ بات، جو اس نے اتنے خوب صورت اور دلنشین پیرائے میں سمجھائی تھی کہ اس کے ذہن سے سارا بوجھ اتر گیا تھا اور پھر خود اسے بھی تو تایا کے یہاں جانے کا بے حد شوق تھا۔ گو مستقل طور پر وہاں رہنے کا نہ سہی لیکن اس سے صورت حال ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اس نے بلا سوچے سمجھے محض اپنے محبوب کی خوشنودی کی خاطر کہہ دیا۔

"اچھا اچھا جناب! آپ کی اطلاع کو ہم نے بھی اپنا فیصلہ بدل دیا ہے کیونکہ ہمیں چھوٹے ملک کی خوشی اور خوشنودی سے زیادہ ہمیں کوئی شے عزیز نہیں ہے نہ کہ یہ گھر بھی۔ بلا سے یہ سال بھی ضائع ہو جائے ہمارا مگر ہم چھوٹے ملک کے حکم کی تعمیل بہرصورت کر کے رہیں گے۔"

"اوہ۔ ہرا ۔۔۔ ہرا چھوٹی ملکانی زندہ باد۔" وہ جو بالکل



متوقع نہ تھا کہ وہ اس کی لچھے دار گفتگو سے متاثر ہو جائے گی۔ خوشی سے بے قابو ہو کر اس نے نعرہ لگایا۔ پھر اسے سامان پیک کرنے اور صفیہ بیگم سے اپنے لاکر کی چابی اور کاغذات حاصل کرنے کی اور چلنے کے لیے تیار رہنے کی تاکید کر کے وہ چلا گیا۔

طے تو یہ ہوا تھا کہ دونوں بذریعہ کار کراچی تک سفر کریں گے اور اس پروگرام کے تحت چوتھے ہی روز وہ آ گیا تھا۔ وہ اپنے کوچ کرنے کی ساری تیاریاں مکمل کیے اپنا سارا ضروری سامان یعنی تمام کپڑے قیمتی اشیاء اور زیورات سب کچھ پیک کر چکی تھی۔ ہرچند کہ صفیہ بیگم نے اسے تیمور کے ساتھ جانے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ کتنا سمجھایا۔ بجھایا بھی تھا اور یہ تک جتا دیا تھا کہ اس کی امی ان لوگوں پر بالکل اعتماد نہیں کرتی تھیں اور ناصرہ بیگم سے تو وہ بالکل واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ زیور لاکر سے نکلوانے اور اپنے ساتھ کراچی لے جانے پر خوب احتجاج بھی کیا تھا۔ یہ تک کہہ دیا تھا کہ تم بڑی خوشی سے لاکر کی چابی لے جاؤ مگر زیورات لاکر میں چھوڑ جاؤ اور کاغذات بھی لاکر میں ہی رکھوا جاؤ کہ نہ معلوم وہاں جا کر تمہیں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے اور کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے لہٰذا پہلے وہاں جا کر حالات کا اندازہ لگا لو پھر زیور بھی منگوا لینا اور ملتان سے کراچی تک اس کے کار میں سفر کرنے پر بھی انہوں نے بڑے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ یہ جتا جتا کر کہ تمہاری امی تو مجھے تاکید کر گئی تھیں کہ میں تمہارا پورا پورا خیال رکھوں تمہاری اچھی طرح حفاظت کروں اور تم ہو کہ اتنا بڑا رسک لے رہی ہو۔ غرضیکہ صفیہ بیگم نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی اسے روکنے کی مگر اس پر تو تیمور کے عشق کا بھوت کچھ اس بری طرح سوار تھا اور اپنے سگوں کے خون کی کشش اس بری طرح اپنی طرف کھینچ رہی تھی کہ اس نے صفیہ بیگم کی کسی بات پر کان نہیں دھرا اور وہی کیا جو اس کا دل چاہا۔ البتہ کار کے بجائے ریل کے ذریعہ کراچی تک سفر ضرور کر کے آئی۔ کیونکہ بعد میں خود تیمور نے کار سے جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ کار کو بعد میں ریل کے ذریعہ کراچی منگوا لیا جائے گا۔

وہ کراچی پہنچی تو اس کا استقبال تایا تائی اور ان کی اولاد نے کچھ اتنی گرمجوشی، تپاک اور محبت سے کیا جیسے وہ اپنی رعایا سے بچھڑی ہوئی کوئی گمشدہ شہزادی ہو۔ جو غیر متوقع اور اچانک اپنی راجدھانی میں واپس چلی آئی ہو۔

تایا والہ وشیدا تو تائی صدقے واری۔

اور چچا زاد دم دیوانے۔

جو کام کیا جا رہا ہے اس کی پسند سے۔

حتیٰ کہ کھانا تک اس کی پسند پوچھ پوچھ کر پکوایا جاتا تھا۔

تایا جی جب بھی بازار جاتے اس کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی قیمتی اور اچھوتی چیز لاتے کہ وہ دنگ سی رہ جاتی۔ تایا تو ہمیشہ اور ہر موقع پر اس سے بات کرتے کرتے بھائی بھاوج کو یاد کر کے رونے لگتے اور تائی کبھی اس کی بلائیں لے کر کبھی اس کو گلے سے لگا کر بڑی آزردگی سے کہتیں۔

"آہ مجھے معلوم ہوتا کہ زریں اتنی جلد ہم سے روٹھ کر چلی جائے گی تو میں خود جا کر اسے منا لیتی۔ آہ بے چاری نے کتنی کم عمر پائی ورنہ ابھی تو اس کے جینے کے دن تھے۔ یقین جانو جب میں نے اس کے انتقال کی خبر سنی تائی بشیراں کی زبانی تو میرا دل چاہا کہ ان کا منہ نوچ لوں میں تو ان سے لڑ بھی پڑی تھی اس بات پر اور جب تمہارے تایا جی نے اس خبر کی تصدیق کی تھی۔ تب بھی مجھے یقین نہیں آیا تھا اور جب آیا تو ہائے ہائے۔" اور پھر گلا رندھ جانے کی وجہ سے بات ادھوری چھوڑ کر آنکھیں رگڑنے لگتیں۔ کبھی کہتیں۔

"میں تو جب تم پیدا ہوئی تھیں تب ہی سے تمہیں گود میں کھلانے اور دیکھنے کو ترسا کرتی تھی۔ ان اکیس بائیس سالوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا گیا ہو گا جب میں نے تمہارا ذکر نہ کیا ہو۔ بلکہ تمہارے تایا سے بھی کہتی تھی کہ جا کر بھائی بھاوج کو منا لو اور کسی طرح اسماء کو یہاں لے آؤ اور جب زریں کا انتقال ہوا تھا تو تمہارے تنہا رہ جانے کے خیال سے میری راتوں کی

نیندیں اڑ گئی تھیں اور میں نے ہی کہہ کہہ کر زبردستی تمہارے تایا کو تمہارے پاس بھیجا تھا مگر جب وہ ناکام واپس لوٹے تو مارے رنج کے کئی روز تک بخار میں مبتلا رہے۔ پھر خدا نے تم سے ہمیں ملانے کی خود ہی ایک سبیل نکال دی کہ تیمور کا تبادلہ ملتان کا کر دیا اور تم خدا کے فضل سے اپنوں میں آ گئیں ورنہ تیمور کا تبادلہ اگر نہ بھی ہوتا تو میں نے اب کے تہیہ ہی کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو خود جا کر تمہیں لے آؤں گی۔"

اور اس کے علاوہ بھی تائی اماں ایسی پیاری اور خلوص بھری باتیں کرتیں کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ اس کی امی نے یا تو ان لوگوں کو سمجھنے میں غلطی کی تھی یا پھر بقول تیمور جیٹھانی' دیورانی کے درمیان جو ایک جیلسی سی کار فرما ہوتی ہے اس کی وجہ سے امی تائی سے لڑ بھڑ کر بیٹھ گئی تھیں اور ابو کو بھی انہوں نے اپنا ہم خیال بنا لیا تھا کہ ابو تو امی کے شروع ہی سے پورے پورے کنٹرول میں تھے اور اس بات پر تو اسے افسوس ہی نہیں سخت پچھتاوا بھی ہوتا تھا کہ اس کی امی نے ایسا کیوں کیا تھا۔ کیوں ان اتنے اچھے اور پرخلوص لوگوں سے قطع تعلق کر کے بیٹھ گئی تھیں۔ یہ لوگ اس پر اپنے خلوص اور محبت کے خزانے لٹا رہے تھے تو اس نے بھی اپنے خلوص و محبت کا دامن ان کے لیے وا کر دیا تھا۔ وہ بھی گھر اور گھر والوں کے ہر معاملے اور ہر کام میں دلچسپی لینے لگی تھی یہ اور بات تھی کہ تائی اسے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی تھیں بلکہ خود دوڑ دوڑ کر اس کے کام کرتی تھیں اور تیمور کی تو تمام تر توجہ اور دلچسپیاں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں اور وہ خود کو فضاؤں میں بہت اونچا اڑتا محسوس کر رہی تھی کہ رکھی کے ایک جان لیوا انکشاف اور تائی اور تیمور کی باتوں نے ایک دم ہی اس کے پر قینچ کر دیے اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہی۔

تمام رات جو کچھ ہوا تھا اور اب تک ہوتا رہا تھا۔ اس کی ریل ریوائنڈ ہوتی رہی تھی اور پھر سب کچھ اسکی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن نہ اس کی تو یہ بات کہ یہ لوگ اس کی جان کے درپے کیوں ہو رہے ہیں اور کس وجہ سے اسے مار دینا چاہتے ہیں؟ رکھی کہہ رہی تھی۔

"یہ روپے پیسے کا معاملہ بہت بری چیز ہوتا ہے۔" "تو میرے پاس ایسا کچھ خزانہ بھی نہیں بس تھوڑے سے زیورات ہیں یا ایک مکان اور گاڑی تو میں نے تیمور کو دے ہی دی ہے اور زیورات بلکہ قیمتی اور نایاب چیزیں تائی نے آتے ہی اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ تو کیا صرف ایک معمولی سے مکان کی وجہ سے میری جان کے لاگو ہو گئے ہیں۔

مگر زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کب تھا۔ اسے تو اپنی جان کی پڑی تھی جان۔ جو انسان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتی ہے کہ قدرت کا ایک عطیہ اور امانت ہوتی ہے انسان کے لیے۔

اور پھر انجانے میں تو خواہ کچھ بھی بیت جائے لیکن جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی موت اس کے سر پر کھڑی ناچ رہی ہے وہ بھی کس طرح کہ کوئی اسے زہر دے رہا ہے تو شاید اس کی یہی کیفیت ہوتی ہو گی جیسی کہ اس کی اس وقت ہو رہی تھی۔ چین' سکون' نیند حتیٰ کہ بھوک و پیاس بھی اڑ چکی تھی۔ سوائے خوف و دہشت کے اور خوف بھی ایسا ویسا کہ اعتماد کو اتنا زبردست شاک لگنے کے باوجود اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک ذرا سی آنکھ بند کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے موت اپنے بھیانک جبڑے کھولے اس کی طرف بڑھ رہی ہو۔ تائی اور تیمور تیز دھار چھرا لیے اسے ذبح کرنے کو تیار کھڑے ہوں۔

خوف و دہشت کی وجہ سے اس سے لیٹا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جبکہ کمرے کا دروازہ ہی نہیں ڈر کے مارے کھڑکی کے پٹ بھی اس نے بند کر کے چٹخنے چڑھا دیے تھے۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ کمرے میں جلتا ہلکے پاور کا بلب بھی بجھا دے مگر ہمیشہ ہی سے اسے گھپ اندھیرے میں وحشت سی ہوتی تھی بس وہ تو کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور کبھی ٹہلنے لگتی۔ ایک تواتر سے تیمور کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"سلو پائزننگ کرنے سے خون آہستہ آہستہ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے اور اعضاء بھی بتدریج متاثر ہوتے جاتے ہیں۔ اگر بہت سخت جان ہوئی تو زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ماہ اور کھینچ لے گی ورنہ پندرہ دن۔" اور

الفاظ کی اس گونج کے ساتھ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے سارے جسم میں زہر ہی زہر بھر گیا ہو اور خون گاڑھا ہو کر جمنے لگا ہو۔

اف پتا نہیں یہ لوگ کب سے مجھے دودھ میں زہر دیتے آرہے ہیں اور کتنی مقدار میں یہ زہر میرے جسم میں پہنچ چکا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس کی دھڑکنیں خطرناک حد تک تیز ہو جاتیں۔ ہاتھ پیروں میں تشنج سی کیفیت ہونے لگتی اور وہ سرتاپا پسینوں میں نہا جاتی تو اس کا جی چاہتا اس کمرے سے ہی نہیں اس گھر سے ہی بھاگ نکلے اور کسی ایسی جگہ جا چھپے کہ یہ لوگ کبھی اس کی خاک پا کو بھی نہ پا سکیں مگر جائے تو کہاں جائے؟

اس اتنے بڑے کراچی شہر میں جس کی وہ سڑکوں سے واقف تھی نہ علاقوں سے اور کراچی کے راستے بھی ایسے کہ خدا کی پناہ۔

اور پھر اس اتنے بڑے ہنگامہ خیز شہر میں اس کا کوئی جان پہچان والا تھا نہ واقف کار۔ البتہ رشتے کے ایک چچا ملک پرویز کا بیٹا اکرم پرویز ضرور گلشن اقبال کے علاقے میں رہتا تھا۔ اب سے چار ماہ پہلے جب وہ بالکل نئی نئی کراچی آئی تھی تو ایک روز وہ اپنی ماں نسرین کے ساتھ تایا تائی سے ملنے آیا تھا اور جب نسرین کو پتا چلا تھا کہ اسماء ملک فواد اور زریں کی بیٹی ہے تو وہ اسے گلے لگا کر بہت روئی تھیں اور جب تک موجود رہی تھیں تمام وقت خاص طور پر اس کی ماں کی خوب صورتی اور اخلاق کا ہی ذکر کرتی رہی تھیں۔ اس نے بھی اپنی ماں کی زبانی ان کی بڑی تعریفیں سنی تھیں اور نسرین کی بڑی بیٹی فوزیہ جو کسی زمانے میں ملتان میں رہائش پذیر تھی اسماء اس سے بھی مل چکی تھی مگر نسرین سے پہلی بار اب ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور انہوں نے جس محبت اور یگانگت کا اظہار کیا تھا اس سے اسماء بڑی متاثر ہوئی تھی مگر جب چلتے وقت انہوں نے چپکے سے کہا تھا۔

"ان لوگوں سے ذرا ہوشیار رہنا بچی! یہ تمہارے خیر خواہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتے۔" تو وہ اپنے اتنے جان چھڑکنے والوں کے متعلق ایسی چھچھوری بات سن کر نسرین سے اتنی کبیدہ ہوئی تھی کہ ان کے بہت اصرار سے بلا جانے کے باوجود بھی ان کے گھر نہیں گئی تھی۔

دل میں تو کئی بار آئی کہ وہ نسرین کی بات تائی کو بتا دے مگر اس کی ایک تو ادھر ادھر لگائی بجھائی کرنے کی عادت نہیں تھی دوسرے اس نے چاچی نسرین کی اس بات کو یہ سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ ممکن ہے انہوں نے امی کی دوست ہونے کی حیثیت سے محض میری بھلائی اور ہمدردی میں کہہ دیا ہو۔ چاچی نسرین تو اپنی بہو کی زچگی کرانے کو صرف چند ہفتوں کے لیے ہی کراچی آئی تھیں پھر سنا کہ وہ واپس چلی گئیں اور اب ان کی نصیحت کو یاد کر کے پچھتانے کے ساتھ ساتھ وہ یہ سوچ سوچ کر متاسف سی ہو رہی تھی کہ کاش میں اکرام بھائی کے ہاں ایک بار ہی ہو آتی تو کم از کم مجھے معلوم تو ہو جاتا کہ وہ کہاں اور کس علاقے میں رہتے ہیں۔

ان ظالموں نے تو کس بری طرح مجھے بے بس اور بے دست و پا کر کے رکھ دیا، کتنی بیدردی سے میرے پر قینچ کر دیے ہیں۔

کہ میں اس گھر سے کہیں جا بھی نہیں سکتی۔

اب اس پر سارا بھید کھلا تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ تایا اور تائی کے سارے بچے حتی کہ فیضان اور رجتے بھی اس کی کڑی نگرانی کرتے رہے ہیں کیونکہ گھر ہی میں اگر وہ ذرا سی دیر کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تھی تو کوئی نہ کوئی ضرور اسے ڈھونڈتا ہوا آ جاتا تھا۔

وہ تمام رات کبھی بیٹھ کر اور کبھی ٹہل ٹہل کر یہی سوچتی رہی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ کیونکہ یوں جانتے بوجھتے تو وہ زہر کھانے سے رہی تھی۔

تو کیا ان لوگوں کو جتا دے کہ اسے ان کے مجرمانہ عزائم کا علم ہو گیا ہے یا صرف تیمور کو ہی بتا دے۔ اس نے اس روز بڑے دعوے سے کہا تھا کہ اگر کوئی ایسا موقع آیا تو ہم عملی طور پر تم کو دکھا دیں گے کہ ہم تم پر کس طرح جان نثار کرتے ہیں۔

اف نہیں نہیں۔ اصل میں تو وہی سب سے بڑا فراڈ ہے۔ بھانڈا پھوٹنے پر کہیں وہی کھڑے کھڑے میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار نہ دے۔ اف میرے معبود تو پھر میں کیا کروں اے میرے رب رحیم تو مجھ پر رحم فرما میں بالکل بے کس اور بے یار و مددگار ہوں۔ تو مجھے ایسی بے بسی کی موت سے بچا لے۔ یا الہ العالمین تو مجھے ان ظالموں کی قید سے نجات دلا دے۔" سوچتے سوچتے اس کا ذہن سلگ اٹھا تو وہ مدد کے لیے اپنے مولا کو پکارنے لگی۔

سب سے زیادہ دکھ، رنج و ملال اور غم اسے تیمور کی بے وفائی اور فریب کاری پر تھا۔ آہنی ستونوں پر کھڑی یقین و اعتماد کی مضبوط اور ٹھوس عمارت کچھ اس طرح ڈھی تھی کہ اس کا ملبہ تک باقی نہ بچا تھا۔ سوچتے سوچتے، ٹہلتے اور خوف کھاتے کھاتے وہ ہلکان سی ہو گئی تھی۔ رات کے آخری پہر میں تھک کر بستر پر بیٹھی تو بیٹھے بیٹھے ہی آنکھ لگ گئی۔

گو وہ تھک کر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی مگر آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ آیا تھا اور کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا اسماء کا دل تو چاہا کہ جواب ہی نہ دے اور آنکھیں بند کیے پڑی رہے مگر اب دروازہ پیٹنے کے ساتھ ساتھ تائی اسے آوازیں بھی دے رہی تھیں لہٰذا بادل نخواستہ اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

"ہے، ہے۔ خیر تو ہے بچی! تم آج اتنی دیر تک سوتی رہیں۔ میں تو دو بار اور بھی دروازہ بجا کر بجا چکی ہوں مگر اب تو مجھے تمہاری طرف سے تشویش ہی ہونے لگی تھی۔" تائی نے دہلیز پر کھڑے کھڑے ہی کہا جبکہ وہ دروازہ کھولتے ہی مڑ کر اپنے بستر کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی کہ تائی کو اپنی شکل دکھانا چاہتی تھی نہ ان کی شکل دیکھنے کی روادار تھی اور بالکل گنگ سی کھڑی تھی کہ انہوں نے اندر آ کر کہا۔

"اے یہ کھڑکی کیوں بند کر رکھی ہے۔ سارا کمرہ گھٹ کر رہ گیا۔" اور پھر وہ خود ہی آگے بڑھ کر کھڑکی کھولنے لگیں۔

"وہ اصل میں رات کو ٹھنڈ سی لگ رہی تھی اس لیے بند کر دی تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جواب دینا پڑا۔

"ٹھنڈ لگ رہی تھی تمہیں اس موسم میں؟" وہ کھڑکی کے پٹ کھول کر اس کی طرف پلٹتی ہوئی بولیں۔

"کیا ساری رات جاگتی رہی ہو جو آنکھیں سوج رہی ہیں۔ کہیں سچ مچ طبیعت تو خراب نہیں تمہاری۔" تائی نے تردد کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، سر میں درد ہو گیا تھا رات کو... اصل میں کھانا کچھ زیادہ ہی کھا گئی تھی۔ اب تک طبیعت مالش کر رہی ہے۔" اس نے فوراً بہانا گھڑا۔

"ہائیں تو کیا الٹیاں بھی ہوئی تھیں تمہیں۔" تائی نے بظاہر تردد کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ مگر ان کے لہجے میں ایک تجسس سا پنہاں تھا۔

"نہیں... البتہ دو تین موشن ضرور آئے تھے!"

"ہائے جلاب بھی آئے تھے۔ پھر تو یقیناً تمہیں ڈائریا ہو گیا ہے۔" تائی نے بڑی پریشانی دکھاتے ہوئے کہا اور وہ خاموش ہی رہی۔

"خیر گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں ابھی اپنے ڈاکٹر کو بلا کر دکھائے دیتی ہوں تمہیں۔"

"نہیں تائی اماں! ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ اب تو میں بہت بہتر فیل کر رہی ہوں۔" ڈاکٹر کے خیال ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اچھا تو ایسا کرو کہ لیٹ جاؤ اور تھوڑی دیر اور سو لو۔ میں ابھی چائے کے ساتھ تمہیں سر درد کی گولیاں بھجواتی ہوں۔"

اف گولیاں... چائے... گولیاں اگر زہریلی ہوئیں اور چائے میں زہر ہوا تو اس نے لرز کر دل میں سوچا۔

"نہیں تائی اماں! اس وقت مالش کی وجہ سے میری طبیعت کسی چیز کو بھی قبول نہیں کر سکے گی۔"

"نہیں چائے کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ ضرور کر لو۔ کیونکہ کبھی کبھی معدہ خالی ہونے کی وجہ سے بھی طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔" تائی نے اصرار کرنے کے انداز میں کہا اور پھر اسے شانوں سے پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔

"بس ابھی بھجواتی ہوں تمہاری چائے اور درد کی گولیاں۔ مگر خالی پیٹ میں گولیاں ہرگز نہ کھانا۔ چلو شاباش، چکھنے کے طور پر ہی تھوڑا سا کھا لینا۔ ورنہ تمہاری طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جائے گی۔"

اور پھر تائی اس کے بستر پر اسے لٹا کر باہر نکل گئیں اور جب تھوڑی دیر بعد گھر کی ایک ملازمہ ٹرے میں اس کے لیے ناشتہ چائے اور گولیاں لائی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہر چیز زہریلی ہو۔ وہ ٹرے کو واپس لے جانے کا اشارہ کر کے دانستہ ابکائیاں لیتی جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔ اور جیسا کہ اس کا خیال تھا کہ اب تائی اپنی پسلی پھڑکاتی ہوئی فوراً" آنازل ہوں گی اور زبردستی کہہ کہہ کر اسے ناشتہ کرائیں گی تو شکر ہوا کہ وہ خام ہی نکلا۔ تائی تو کیا گھر کا کوئی فرد بھی اس کی خیریت پوچھنے نہیں آیا۔ تب اس نے سکھ کا سانس لیا اور وہیں پڑ کر ایسا سوئی کہ شام ہوتے ہی آنکھ کھلی۔ تو رات کے خیال سے ہی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے کہ جب رات کو تائی بڑے چاؤ سے اس کے لیے دودھ لائیں گی تو پھر وہ کیونکر انکار کر سکے گی؟ کل تو خیر کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دیا تھا مگر آج بہانا کیسے نبھا سکے گی یہ بات اور اب تو کوئی بہانا بھی نہیں چلے گا۔ تائی نے تو رات ہی تیمور کے سامنے کہہ دیا تھا کہ اب اگر اس نے دودھ پینے سے انکار کیا تو اس کا منہ چیر کر پلاؤں گی۔

خیر خواہ کچھ بھی ہو میں وہ دودھ تو مر کر بھی نہیں پیوں گی۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا۔

صبح سے اس نے نہ منہ دھویا تھا نہ بال سنوارے تھے حتیٰ کہ لباس بھی نہیں بدلا تھا اور شام کو آنکھ کھلنے کے باوجود وہ کاہلی اور بے دلی سے بستر پر ہی پڑی رہی تھی حتیٰ کہ رات ہو گئی تھی اور آج اسے کھانے پر بھی کوئی بلانے نہیں آیا تھا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد تائی ملازمہ سے کھانے کی ٹرے اٹھوائے دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اف کھانا ہی اسے زہریلا ہلاہل لگ رہا تھا کہ اس پر دودھ کا گلاس یوں لگا جیسے پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جا رہا ہو۔۔۔ کھانے سے وہ انکار کر سکتی تھی نہ دودھ سے۔ تائی نے کہا تھا کہ وہ اس کا منہ چیر کر اسے دودھ پلائیں گی۔ اس خیال سے وہ کچھ ایسی بدحواس اور نروس ہوئی کہ جب تائی کے کہنے پر اس نے بہت ڈرتے ڈرتے پہلا نوالہ منہ میں رکھا تو حلق اور منہ اتنا خشک ہو گیا اور جبڑے ایسے اکڑ گئے کہ اس سے نوالہ چبایا ہی نہ جا سکا اور ابکائی آگئی تو اس نے فوراً" ہی نوالہ اگل کر کہا۔

"نہیں نہیں۔ میری طبیعت خراب ہے' یہ کھانا مجھ سے ہضم ہی نہ ہو سکے گا۔ بلکہ کھایا ہی نہیں جا رہا۔"

"چلو چلو خیر! اگر نہیں کھایا جا رہا تو نہ کھاؤ مگر یہ دودھ تو پی لو بٹی۔ یہ تو بہت رقیق غذا ہے۔ آخر تمہارے پیٹ میں کچھ تو جانا چاہیے' پہلے ہی اتنی دھان پان سی ہو دودھ بھی نہ پیا تو بالکل ہی کمزور ہو جاؤ گی۔"

افوہ دودھ پلانے کے لیے اتنی چاپلوسی۔ اس نے دل میں سوچا وہ گلاس اس کی طرف بڑھائے کھڑی تھیں چار و ناچار اسے ان کے ہاتھ سے گلاس لینا ہی پڑا اور گلاس لیتے ہی معاً" وہ ترکیب اس کے ذہن میں آگئی جس پر ابھی ابھی بہت غیر ارادی طور پر اس نے عمل کیا تھا۔ یعنی وہی ابکائی اور قے کر دینے کی۔ ویسے بھی اسے دودھ پینے کے تصور سے ہی ابکائیاں آ رہی تھیں پھر جوں ہی اس نے دودھ کا گھونٹ لیا ایک زور کی ابکائی آئی اور سارا گھونٹ اس کے منہ سے نکل کر اس کے کپڑوں پر گیا اور تھوڑا سا قالین پر بھی۔

"اف نہیں نہیں تائی اماں! مجھ سے تو یہ بھی نہیں پیا جا رہا آپ پلیز برا نہ مانیں۔ میں پھر کسی وقت پی لوں گی۔" وہ اتنی عاجزی سے بولی کہ ناصرہ بیگم اندر ہی اندر کھول اٹھنے کے باوجود مزید اصرار نہ کر سکیں اور غصے میں گلاس ہاتھ میں لے کر ملازمہ کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

اف فی الوقت کتنی بڑی مصیبت ٹل گئی ہے۔ اسماء نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا اور اٹھ کر دروازے کا اندر سے کھٹکا لگا لیا۔

آخر تم کب تک یوں کمرے میں بند بھوکی پیاسی رہ کر اور جاگ جاگ کر زندہ رہ سکو گی۔ اسماء! یہ لوگ تو چاہ ہی یہی رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تم جلد از جلد ختم ہو جاؤ۔ مر جاؤ۔۔۔ اور یہ سارے آثار ساری ترکیبیں اور طریقے مر جانے کے ہی ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اور کسی کو نہ سہی میں صرف تایا ابو ہی کو بتا دوں



کہ مجھے آپ سب کے خطرناک ارادوں کا علم ہو گیا ہے۔ بہت ممکن ہے ان کی رگوں میں دوڑتا ہوا ابو کا خون جوش کھا جائے اور انہیں میری حالت زار پر رحم آ جائے ویسے بھی وہ ان سب سے بہت مختلف ہیں۔ امی بتاتی تھیں کہ تمہارے تایا اپنی ذات سے بہت اچھے ہیں۔ بہت سادہ لوح اور رحم دل وہ بستر پر گر کر سوچنے لگی لیکن مشکل تو یہ تھی کہ ملک جواد ان دنوں اپنی زمینوں پر گئے ہوئے تھے اور ان کے جلد آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔۔۔ ادھر اس گھر میں گزرتا ایک ایک لمحہ اتنا جاں گسل اور جان لیوا تھا کہ سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

پوری زندگی کبھی اس طرح بھوکی پیاسی نہیں رہی تھی۔

خوف و ہراس اپنی جگہ مگر پیٹ کی آگ تو بڑی ظالم ہوتی ہے۔

کبھی کبھی تو یہ آگ انسان کی ہر خوبی عزت آبرو حتیٰ کہ جوہر انسانیت کو بھی بھسم کر کے رکھ دیتی ہے اور اسی آگ نے اسماء کو تمام رات نڈھال اور بے سکون رکھا تھا کہ وہ سو بھی نہ سکی تھی بلکہ بھوک اور نقاہت کے مارے نڈھال اور بے حال سی پڑی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی مفقود ہو کر رہ گئی تھیں کہ وہ یہاں سے بچ کر نکلنے کی کوئی تدبیر ہی سوچ لیتی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ایک جاپانی فرم کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں اپائنٹمنٹ بھیجنے کے بعد تیمور واپس گھر آیا تو روش پر کھڑی سرخ منی اسپورٹس کار کو دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کے منجھلے ماموں فتح علی آئے ہوئے ہیں جو ان دنوں حیدر آباد میں ایک بہت بڑے پولٹری فارم کو چلانے کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کا کاروبار بھی کر رہے تھے۔

فتح علی جو اپنی بعض خصلتوں اور مزاج کی وجہ سے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے پھر بھی سگے ماموں تھے اور دنوں بعد آئے تھے اس لیے ان سے نہ ملنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ مگر وہ سیدھا ان کے پاس جانے کے بجائے اپنے کمرے میں آ گیا تھا کہ سارے دن کی تھکن کو منہ پر پانی کے چند چھپکے مار کر ہی تھوڑا بہت اتار لے۔ پھر منہ پونچھ کر اور بالوں میں کنگھا کر کے اس نے ماں کے کمرے کا رخ کیا تو ماں کے ایک مختصر سے جملے نے اس کے قدم دروازے پر ہی روک لیے۔

"تیمور کی تو بات ہی چھوڑ دو بھیا! وہ تو مجھے کچھ کرتا ہی نظر نہیں آتا۔" وہ اس کے ماموں فتح علی سے کہہ رہی تھیں۔ گو اپنی دانست میں بہت آہستہ بول رہی تھیں مگر ان کی آواز ہی ماشاء اللہ کچھ اتنی پاٹ دار تھی کہ آہستہ بھی بولتیں تو دوسرا باہر سے بڑی آسانی سے سن لیتا تھا۔

"نہیں کیا مطلب؟ کیا وہ اسے گولیاں نہیں دے رہا۔" فتح علی نے پوچھا۔

"نہیں گولیاں تو وہ دودھ میں گھول دیتا ہے مگر خود نہیں جاتا مجھے آگے کر دیتا ہے۔"

"کہیں اسے پتا تو نہیں چل گیا کہ اسماء فواد کی ہی بیٹی ہے؟"

"نہیں پتا تو نہیں چلا پر کوئی بات ہے ضرور۔ تیمور آج کل بڑا الجھا الجھا سا رہتا ہے۔"

"تم نے بھی تو یہ غلطی کی کہ اسے ملتان اکیلا بھیج دیا۔ میں نے تم سے کتنا کہا بھی تھا کہ تم خود بھی جاؤ اور لڑکی کے پاس جا کر ٹھہرو۔"

"مگر میرے نہ جانے سے کوئی فرق تو نہیں پڑا۔ جو کام ہونا تھا میرے جائے بغیر ہی ہو گیا۔"

"کام تو چلو خیر تمہارا ہو ہی گیا پر منڈے نوں اکیلا بھیج کر تم یہ بھول گئیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے' دونوں اکیلے ملے تو۔"

"ارے نہیں میرا تیمور ایسی کمزور طبیعت کا نہیں ہے۔ اصل میں تو وہ اس کام کو قانون کے خلاف سمجھتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو اس بات سے ڈرتا ہے کہ آج کل ملک میں مارشل لا لگا ہوا ہے کسی کو پتا چل گیا تو سب سے پہلے اس کی گردن ناپی جائے گی۔"

"نہیں تو کیا وہ یہ بھی کہتا ہے؟" فتح علی نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"ارے نہیں زبان سے نہیں کہتا مگر اس کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔"

"تب ہی تو آج اتنے دن ہونے کو آئے تم ماں بیٹے اب تک کچھ بھی نہیں کرپائے اور ادھر میں سمجھ رہا تھا کہ اب تک تم اسے کبھی کا پار لگا چکے ہو گے۔"

"مگر پار لگانا کیا اتنا آسان ہے؟ اور دیر تو تم نے کی ہے ساہیوال سے تار دے کر ملک جی کو بلوانے میں ـــ ورنہ اب تک تو میں کب کی اسے پار لگا چکی ہوتی۔"

"پر میں بھی کیا کرتا آپاں ـــ وہ جیٹرا بندہ سی کام کرن والا وہ بیمار پڑ گیا سی۔"

"ادھر وہ بیمار ہو گیا تھا اور ادھر ملک جی کی موجودگی میں میں کھل کر تو کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو قیامت ہی آجاتی۔"

"بس تمہاری اس کمزوری نے ہی تو اب تک تمہیں کسی قابل نہیں رکھا آپاں ورنہ ایمان نال اگر تمہارا ذرا سا اشارا بھی مل جاتا تو سب سے پہلے تمہارے ملک جی کا ہی پتا صاف کرتا میں ـــ۔" فتح علی ہنس کر بولا۔

"ہائے تیرا فٹے منہ ـــ بے شرمے ـــ میں بھلا اشارا کر سکتی ہوں تجھے ـــ ملک جی کے دم سے تو ساری بہار ہے۔" ناصرہ بیگم نے بھائی کی پیٹھ پر ایک دھپ لگاتے ہوئے کہا تو فتح علی زور زور سے ہنسنے لگا۔

"میں تے ٹھول کر ریاں سی آپاں ـــ پر اب کڑی دا کی حال ہے۔" فتح علی نے ہنس لینے کے بعد پوچھا۔

"آج کل تو بہت پتلا ہو رہا ہے۔ جانے کیا ہو گیا ہے۔ پچھلے دو روز سے سر میں درد اور سینے پر مالش بتاتی ہے۔ جو کھاتی ہے الٹی ہو جاتی ہے اسے اس لیے دو دن سے دودھ بھی نہیں پیا۔ ویسے بھی دودھ پیتے ہوئے وہ اتنے نخرے کرتی ہے کہ میں عاجز آجاتی ہوں۔"

"ہوں تو گویا دوائی اثر کرنے لگی ہے اس پر۔" فتح علی نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

"مگر تعجب ہے۔"

"کس بات پر؟"

"کہ پچھلے دو مہینے سے تم اسے گولیاں دے رہی ہو اور اثر اب ہو رہا ہے۔"

"ہاں ہے تو تعجب کی بات ہی۔"

"ہے نا! آخر کس باپ کی بیٹی وہ یاد ہے تمہیں آپاں! وہ ٹنکی والا واقعہ بچ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو وہ ڈبکیوں میں ہی مر جاتا۔"

"ارے چھوڑ۔ کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ کسی کے کان میں پڑ گیا تو کیا سوچے گا؟ ویسے تم بھی نرے اناڑی تھے کہا تھا دریا پر لے جانے کو اور لے گئے محلے کی ٹنکی پر۔"

"کیا کرتا آپاں ـــ ایک تو اس وقت بڑی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی دوسرے ایک دھیلا بھی میری جیب میں نہ تھا ـــ۔" فتح علی بھولا سا بن کر بولا۔

"چل جھوٹا کہیں کا ـــ اتنے سارے پیسے تو دیے تھے میں نے تجھے۔ کتوں میں ہار گیا ہو گا ـــ۔" ناصرہ بیگم نے پھر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا تو وہ پھر ہنسنے لگا۔

"اچھا آپاں ـــ لو یہ سنبھالو ـــ بڑے کام کی شے ہے ـــ اب میں چلوں گا ـــ۔" فتح علی نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہائیں اتنی جلدی۔ کیا تیمور سے نہیں ملنا تجھے۔" ناصرہ بیگم نے کہا۔

"نہیں آپاں تیمور نہ جانے کب آئے اور مجھے ابھی ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"ارے جا تجھے تو ہر ویلے کوئی نہ کوئی ضرور کام ہی ہوتا ہے جیسے بڑا ہی لاٹ گورنر تو ہے۔"

"تے ہور کی آپاں ـــ تسی کیا مینوں کسی لاٹ گورنر سے کم سمجھدے او۔" فتح علی سینہ اکڑا کر بولا اور وہ پھر پیکٹ بہن کے ہاتھ میں تھما کر آہستہ سے بولا۔

"یہ دوا بہت سنبھال کر رکھنا۔ بڑا قاتل زہر ہے۔ کبھی ضرورت پڑے تو تھوڑا سا اس کے ساتھ جو سرنج ہے اس میں بھر لینا اور بوتل کو فوراً فلش میں پھینک کر پانی بہا دینا۔"

"مگر ـــ مگر کیا میں آج ہی اس کے لگا دوں۔"

"نہیں ـــ نہیں میں تو احتیاطاً دے رہا ہوں کہ اگر گولی اثر نہ کرے تو ـــ۔"

"اچھا اچھا سمجھ گئی یعنی جیسا موقع ہو۔" ناصرہ بیگم نے کہا اور پھر وہ چھوٹا سا پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس سمے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور انداز گھبرایا گھبرایا سا تھا۔

ماموں اس قدر آہستہ بول رہا تھا کہ کوشش کے باوجود دروازے سے لگا کھڑا تیمور ڈھنگ سے سن بھی نہ سکا اور تب ہی بہن کو خدا حافظ کہہ کر فتح علی کمرے سے باہر آنے لگا تو تیمور بھاگ کر دوسرے کمرے کے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اصل میں تو اسی روز سیما ایاز اور صائمہ کسی فنکشن۔ میں گئے ہوئے تھے اور فتح علی ہمیشہ ایسے ہی وقت آتا تھا جب گھر میں اس کی بہن کے سوا اور کوئی موجود نہ ہوتا تھا اور اس کے آنے پر ناصرہ بیگم نوکروں کو بھی ادھر ادھر ٹال دیتی تھیں اور تیمور کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی لیکن اس کے باوجود بھی اس وقت فتح علی کا آنا اسے سخت کھل رہا تھا۔ فتح علی کے کوریڈور سے نکلتے ہی تیمور ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ گتے کا ایک پیکٹ ہاتھ میں لیے ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اسے کہاں رکھیں کہ پیچھے سے تیمور کی آواز آئی۔

"سلام امی جی!" تو وہ اس بری طرح اچھلیں کہ وہ پیکٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا جسے انہوں نے جلدی سے اپنے ڈبل پاٹ کے دوپٹے میں چھپا کر بمشکل ہنس کر کہا۔

"ارے ابھی ابھی تیرا ماما باہر گیا ہے۔ کیا تو اس سے ملا نہیں پتر؟"

"نہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا شوق ہی نہیں تو پھر مل کر کیا کرتا۔" تیمور تیوری چڑھا کر بولا۔

"یہ بری بات ہے پتر! آخر وہ تیرا سگا ماما ہے پھر تو اس سے کیوں خار کھاتا ہے۔" وہ ملامت بھرے انداز میں بولیں۔

"آپ خار کھانے کو کہہ رہی ہیں مجھے تو انہیں اپنا ماما کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

"ہائے ربا ـــ یہ تو کیسی گلاں کر رہا ہے میرے پرا کے بارے میں۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تیرا۔ وہ تو الٹا تیری مدد کر رہا ہے۔" ناصرہ بیگم لتاڑنے کے سے انداز میں بولیں۔

"ہونہہ! مدد بھی کر رہا ہے تو اپنے فائدے کے لیے ہی کر رہا ہے ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں کر رہا ہے۔"

"ہائے ہائے میں مر جاؤں۔ یہ توں اپنے ماما کو کہہ رہا ہے جو تیرے پیو کی جگہ ہے ـــ تیرا بزرگ ہے ـــ" ناصرہ بیگم نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ہونہہ میرا بزرگ ہے اور کام سارے شیطانوں کے سے کرتا ہے ـــ پتا بھی ہے امی جی! یہ آپ کے لاڈلے بھائی صاحب خیر سے لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں۔ بڑے بڑے افسروں اور ساہوکاروں کو سمجھیں آپ۔"

"تو ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ہماری بلا سے کچھ بھی کرتا پھرے۔"

"کمال ہے یہ آپ کہہ رہی ہیں ہونہہ! آخر ہیں نا ان کی ہی بہن لیکن اچھی طرح سن لیں ان کے اوباش اور جاہل بیٹے سے کم از کم میری زندگی میں تو کبھی صائمہ کی شادی ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تو میں خود کب راضی ہوں۔ کوئی اپنے ہاتھوں سے خود اپنی بیٹی کو جہنم میں تو نہیں دھکیلتا اور ملک صاحب کو تو میں نے ہوا تک نہیں دی کہ فتاں نے اپنے لڑکے کا صائمہ پر پیغام بھیجا ہے۔"

"خیر ملک صاحب کی بات تو جانے ہی دیجیے امی جان! وہ بیچارے آپ کی نظروں میں حیثیت ہی کیا رکھتے ہیں تبھی تو کیسے مزے لے رہی تھیں جب وہ ابو جی کو پار لگانے کو کہہ رہا تھا۔"

"اچھا اچھا اب سمجھی۔ تجھے اس بات پر اتنا غصہ آ رہا ہے۔" ناصرہ بیگم نے غور سے اس کی شکل دیکھ کر کہا۔

"نہیں مجھے اس کی باتوں پر نہیں آپ کی باتوں پر غصہ آ رہا ہے۔"

"میری باتوں پر! مگر کون سی باتوں پر؟"

"مجھے اپنی سازش میں ایک آلہ کار کی حیثیت دے کر بھی آپ نے مجھ سے ہر بات چھپائی۔"

"کیہڑی بات پتر۔"

"یہی کہ اسماء فواد چاچا کی جائز اولاد ہے بقول آپ کے حرام کی نہیں ہے۔ ویسے بھی اسماء صائمہ سے چھوٹی ہے یعنی چاچا جی کی شادی کے کئی سال بعد پیدا ہوئی تھی۔"

"ہاں کئی سال بعد تو پیدا ہوئی تھی مگر تجھے تو معلوم ہے کہ اس کی ماں کون تھی اور کیسے لچھن تھے اس کے۔"

"تو پھر ماما کیوں کہہ رہا تھا کہ اسماء فواد کی سگی بیٹی ہے۔" تیمور نے ماں کی باتوں سے کسی قدر متاثر ہو کر پوچھا۔

"وہ ایویں ہی بکواس کر رہا تھا کیونکہ اسے کچھ معلوم ہی کہاں ہے۔ معلوم تو مجھے ہے سب کچھ۔"

"ہوں۔" بیٹا فوراً" ہی ماں کی باتوں پر ایمان لے آیا۔ ناصرہ بیگم اپنی اس کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہو کر سوچنے لگیں پھر قدرے توقف کے بعد انہوں نے اس کی طرف وہ پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لے پھر تیرا ماما یہ بڑے کام کی شے لایا ہے۔" مگر پھر انہوں نے فوراً" ہی ہاتھ پیچھے کر کے کہا۔

"نئیں نئیں اسے تو میں اپنے پاس ہی رکھوں گی۔"

"کمال ہے کدی ہاں کدی ناں۔۔۔ آخر یہ ہے کیا شے۔۔۔" تیمور نے چندرا کر پوچھا۔

"یہ بڑا کاتل (قاتل) زہر ہے۔ فتاں کہہ رہا تھا کہ اسے ہاتھ نہیں لگانا بس پچکاری (سرنج) میں احتیاط سے تھوڑی سی بھر لینا۔"

"مگر کیوں آخر اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔" تیمور نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"اب توں اتنا بھولا بھی نہیں ہے۔۔۔ اسی کے لیے فتاں دے گیا ہے۔ پتا بھی ہے تین روز سے اس نے کھانا کھایا ہے نہ دودھ پیا ہے۔ منجی سے لگ گئی ہے وہ۔۔۔" پھر ناصرہ بیگم اس کی ساری کیفیت بتانے لگیں۔

"ہوں۔ تو پھر اس کا مطلب ہے کہ زہر دینا ہی بیکار ہے اسے کیونکہ اگر یہی حالت رہی تو وہ کسی دم بھی مر سکتی ہے۔"

"ارے نہیں وہ اتنی آسانی سے نہیں مر سکتی پتر۔ بلی کی طرح اس کی سات جانیں ہیں۔ اب تو خود ہی ہمیں کوئی ترکیب کرنا پڑے گی۔ موقع بھی اچھا ہے تیرا پیو بھی گھر پر نہیں ہے۔" ناصرہ بیگم نے آنکھوں کو گھما کر گویا بڑے پتے کی بات بتائی۔

"نہیں امی جان! کم از کم میں تو آپ کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"ارے جا تو کون ہوتا ہے مجھے اجازت دینے والا اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو کرم الہٰی کی باتوں میں آگیا ہے۔۔۔" ناصرہ بیگم بگڑ کر بولیں۔

"نہ چاچے کی باتوں میں آیا ہوں اور نہ واقعی کچھ لگتا ہوں آپ کا مگر آپ سے محبت ضرور کرتا ہوں امی جان! اگر آپ کے خیال میں ابو جی یہاں نہیں ہیں تو کیا اور سب جو موجود ہیں' وہ اندھے تو نہیں ہیں جو یہ نہیں سوچیں گے کہ اچھی بھلی لڑکی کو ایک دم ہی یہ کیا ہوا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو پھر میری گردن کٹے گی سو کٹے گی لیکن آپ کی ساری عزت سارا وقار خاک میں مل جائے گا۔" تیمور سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

"ہائے تو تو جانے کیا کیا سوچ بیٹھا ہے۔۔۔ سارے گھر کو یہی معلوم ہے کہ وہ سخت بیمار ہے۔ اسے کوئی چیز پچ بھی نہیں رہی' ادھ موئی ہو گئی ہے ایک دم۔" وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"بس تو پھر صاف ظاہر ہے کہ زہر اس پر اچھی طرح اثر کر چکا ہے پھر خوامخواہ انجکشن لگا کر خود کو کسی بتھیا میں پھنسانے سے فائدہ خود ہی رینگ رینگ کر کسی دن مر جائے گی۔" تیمور بولا۔

"ہاں ضرور اگر وہ تیرا پیو آگیا نا تو فوراً" ہی ڈاکٹروں کی ٹیم کو بلوا لے گا اور پھر سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔" ناصرہ بیگم آنکھیں نچا کر بولیں۔

"اوہ ہاں تب تو واقعی سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اسے زہر دیا جاتا رہا ہے۔ اگر ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا تو تو۔۔۔" تیمور نے خائف ہو کر دل میں سوچا مگر ماں کے سامنے اپنے



اپنے ان خدشات کا اظہار نہیں کیا۔

"دیکھ اب بھی وقت ہے تو اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔۔۔ دیکھ نا اگر کسی کو شبہ ہوا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں کیا معلوم خود ہی کوئی زہریلی چیز کھالی ہو گی۔ یا پھر کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو گا۔" ناصرہ بیگم بیٹے کو خاموش دیکھ کر پھر سمجھانے لگیں۔

"ویسے امی جی! پہلے یہ بتائیں کہ کیا آپ صرف اس کے مکان اور روپے پیسے کی وجہ سے اسے مارنا چاہتی ہیں۔" اور جیسا کہ تیمور کا خیال تھا کہ جواب میں وہ بے نقط سنائیں گی۔ تو خلاف توقع انہوں نے بنا جلے بھنے جواب دیا۔

"لے ایک بات ہو تو بتاؤں بھی۔ ایک تو تیرا پیو یہ فیصلہ کر کے گیا ہے کہ وہ ساہیوال سے واپس آکر اپنی آدھی جائیداد اس کے نام کر دیں گے اور پھر اس کی ماں نے جس جس طرح مجھے رسوا کیا تھا' جیسی جیسی میری ذلت و تحقیر کی تھی' میرا گھر تک اجاڑنے سے گریز نہیں کیا تھا تو کیا میں وہ باتیں بھول جاؤں گی جنہوں نے میرے دل میں گھاؤ ڈال رکھے ہیں۔ انتقام کی آگ میں میرا سینہ پورے بائیس تئیس برس سے تپ رہا ہے۔ تجھے تو یاد ہو گا۔۔۔ وہ فواد ایک مرتبہ تیری کنپٹی سے بھرا ہوا پستول لگا کر کھڑا ہو گیا تھا وہ تو میں نے اپنا دوپٹہ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا اور ہاتھ جوڑ کر اس کی منت سماجت کی تھی جب کہیں جا کر اس نے تجھے چھوڑا تھا ورنہ میں تو تیری جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔"

"ہاں تھوڑا تھوڑا یاد تو ہے۔۔۔ اور وہ چاچا جی نے چاچا کرم الہٰی کو بلا کر بھی تو کچھ کہا تھا۔"

"ارے وہی بد بخت تو ملا ہوا تھا تیرے چاچا سے۔ اصل میں زریں محلے کے ایک غنڈے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ فواد سمجھا کہ میں نے اسے بھگوایا ہے بس کھڑا ہو گیا تجھ پر پستول تان کے۔ اف بدنامی سی بدنامی ہوئی تھی میری تیرے ابو کو بھی مجھ سے فرنٹ کر دیا تھا اس حرافہ زریں نے۔ وہ تو جب تیرے ابو کو اصل واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے اسی وقت دونوں کے گھر سے نکال دیا تھا۔" ماں بتاتی رہیں اور وہ سنتا رہا۔

"اور پھر یہ اسماء اول تو فواد کی بیٹی نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو میں تو یہ کبھی برداشت ہی نہ کر سکتی تھی کہ وہ ہماری آدھی جائیداد پر قابض ہو کر بیٹھ جائے اور میرے اپنے بچوں کی حق تلفی ہو اور میرے میاں کی اتنی محنت کی کمائی غیروں کے قبضے میں چلی جائے' تیرے ابو کا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے جو وہ خوامخواہ ہی مرے ہوئے بھائی پر قربان کرنے کو تیار ہے سب کچھ اصل میں اسے کچھ معلوم بھی تو نہیں۔" ناصرہ بیگم اپنے بیٹے کو بہتے چڑھتا دیکھ کر پھر بولیں۔

"اوہ! اگر یہ بات ہے تو پھر ابو جی کو اس ساری حقیقت سے آگاہ کیوں نہیں کر دیتیں۔ یہ بات تو میں بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہماری جائیداد کسی اور کے قبضے میں چلی جائے۔" تیمور نے ان کی باتوں پر متفق ہو کر مشورہ دیا۔

"ارے ایک دو بار' میں نے تو لاکھ بار سمجھایا ہے انہیں۔۔۔ مگر میری بات کو تو اس چنڈالنی زرین کی وجہ سے وہ کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ اس پر ان کے یہ ذات برادری والے کم بخت ہمیشہ ہماری گھات میں ہی لگے رہتے ہیں اور پھر انہوں نے تو شاید کسی وکیل سے لکھت پڑھت بھی کروالی ہے جائیداد کے سلسلے میں۔" ناصرہ بیگم نے بڑی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ خاموش سا کچھ سوچتا رہا پھر خاصے توقف کے بعد بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے امی جان! آج تو میں بہت تھک گیا ہوں سارا دن بزنس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر کر کے۔ آج آپ اسے دودھ نہ دیجئے البتہ کل اگر وہ دودھ پینے سے انکار کر دے تو پھر سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے گا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اور منہ چیر کر اسے دودھ نہ پلوایا ہو تو میرا نام بھی تیمور نہیں۔"

"اوہ! پھر وہی دودھ۔"

"ہاں امی جی۔۔۔ ایک آخری کوشش کر کے دیکھیں گے۔ دودھ بھی تو خاص قسم کا ہو گا نا اور پھر اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو پھر ماسے جی کا لایا ہوا نسخہ

ہی آزمائیں گے۔" اس نے ماں کو تسلی دی اور پھر مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

بس تیمور کے اندر یہی تو ایک کمزوری تھی کہ وہ دوسروں کی باتوں سے متاثر ہو جاتا تھا اور ماں کی تو ہر بات پر آمنا اور صدقنا کہنے کا عادی تھا۔ تبھی تو سمجھے سے اکھڑتے اکھڑتے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سخت مجرمانہ کام ہے' وہ اسے اپنے ذمے لینے پر فوراً" راضی ہو گیا تھا اور ڈیڑھ ماہ سے مسلسل اسے دودھ میں زہر کی گولیاں گھول کر پلوا رہا تھا۔ مگر اسماء پر زہر کے خاطر خواہ اثرات مرتب نہیں ہو سکے تھے اس کی وجہ اصل میں تو یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر جس کے مشورے پر یہ گولیاں کھلائی جا رہی تھیں بہت محتاط اور چوکس تھا اور یہ بھی اسی کا مشورہ تھا کہ اس معاملے میں عجلت نہ دکھائی جائے بلکہ کچھ تاخیر ہو جائے تو زیادہ مناسب رہے گا تاکہ ہم پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے اور نہ ہم قانون کی گرفت میں آئیں۔ مگر اب تو تیمور بھی اسے زہر دیتے دیتے تنگ آ گیا تھا۔ چائے وہ پینے کی عادی نہیں تھی اور دودھ سو نخروں سے پیتی تھی اور پچھلے دو روز سے تو اس نے کھانا کھایا تھا نہ دودھ پیا تھا اور اب ماں کی باتوں میں آ کر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ نتائج کتنے بھی بھیانک کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں اس نے اگر اب بھی اپنی ضد نہیں چھوڑی یعنی دودھ نہیں پیا تو وہ خود اس سے نمٹے گا خود اپنے ہاتھوں سے اسماء کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اور اسماء بے چاری کی ضد ہی کیا تھی۔ اب اس پر جب سے یہ دل خراش حقیقت منکشف ہوئی تھی کہ اسے سلو پوائزننگ کیا جا رہا ہے اس پر موت کا خوف اس قدر غالب آ گیا تھا کہ اس کی بھوک اور پیاس اڑ گئی تھی۔ اس پر پیٹ کئی روز سے خالی رہنے کی وجہ سے معدے کی تھیلیوں میں اس حد تک خشکی آ گئی کہ وہ کسی چیز کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔

مگر اب تو اس پر اس قدر ضعف طاری ہو گیا تھا کہ اٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ دو روز سے ایک کھیل تک اڑ کر منہ میں نہیں گئی تھی بس کلیجہ ایک دم ہی منہ کو آنے لگتا تھا تو وہ اٹھ کر غسل خانے کے نل سے پانی پی لیتی۔ مشکل تو یہ تھی کہ رکھی بھی اس دن سے پھر نظر نہیں آئی تھی ورنہ چپکے سے اس سے کچھ منگوا کر پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر لیتی۔ صاف ظاہر تھا کہ رکھی کو اس کے کمرے میں آنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

تیسرے روز اس کی آنکھ بھوک اور ضعف کی شدت سے بہت سویرے ہی کھل گئی تھی۔ اتنی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ اٹھ کر غسل خانے تک ہی چلی جائے۔ وہ تو بلا منہ دھوئے ہی اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ فیضان یا کوئی اور ملازم اس کا ناشتہ جلدی سے لے آئے کیونکہ اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ خواہ ناشتے میں زہر ہلاہل ہی کیوں نہ ملا ہوا ہو کھائے بغیر نہ رہوں گی۔ ہاں بھلا کہاں تک یہ فاقے برداشت کر سکوں گی۔ کیونکر جی سکوں گی اس طرح یہ لوگ تو چاہتے یہی ہیں کہ میں کل کی مرتی آج مر جاؤں۔ ان کی تو دلی مراد بر آئے گی لیکن وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی مگر کوئی اس کا ناشتہ لے کر نہیں آیا حتیٰ کہ دن بھی چڑھ آیا اور وہ مایوس ہو کر یہی سوچ رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اس خیال سے اسے اپنے نیم جان ہوتے جسم میں ایک توانائی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی کہ اس کا ناشتہ آ گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا مگر دروازہ کھولتے ہی وہ پوری جان سے کانپ اٹھی۔ دروازے پر تیمور کھڑا تھا۔ براؤن چیک کے قیمتی سوٹ میں ملبوس اپنی تمام تر وجاہت اور فریبی شخصیت کے ساتھ' ایک حسین سی مسکراہٹ اس کے غلاظت بھرے بدنما چہرے پر چڑھے خوب صورتی کے خول پر پھیل رہی تھی اور آنکھوں سے وہی پر فریب اور جھوٹی محبت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ کچھ ایسی بدحواس ہوئی کہ جلدی سے مڑ کر اپنے بیڈ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"او ہو اتنی خفگی کہ شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہو۔ مگر خطا کیا ہے میری پہلے یہ تو بتا دو۔" چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔

اف اس قدر مکر و فریب جفا کاری اور عیاری بھلا اور ناپاک ارادے ہلاک کر دینے کی تدابیر۔ اور سب سے بڑھ کر سلو پوائزننگ کرنا۔ اور دوسری طرف یہ سحر انگیز اور فسوں کار گفتگو۔ والہانہ اور از خود رفتہ سا انداز عشق کی وہ شوریدہ سری وہ وعدے وعید اور عہد و پیمان۔ وہ سبز باغ جو مستقبل کے آئینے میں اس نے اسے دکھائے تھے۔ اف یہ سارے احساسات۔۔۔ ساری یادیں۔ اس کی بات سنتے ہی انگاروں کی طرح دہک اٹھیں تو سینے میں نفرت کا ایک لاوا سا ابلنے لگا۔

جی چاہا اس کا گریبان پکڑ کر اس کے اتنے تھپڑ مارے اتنے تھپڑ کہ اس کے چہرے پر چڑھا خوب صورتی کا خول پگھل کر گر جائے۔

چیخ چیخ کر کہے کہ مجھ سے ایسی مکارانہ گفتگو نہ کرو۔

مجھ پر تمہاری اس کرم خوردہ اور مجرمانہ شخصیت کا پول کھل چکا ہے۔

میں تمہارے تمام ناپاک اور خطرناک ارادوں سے آگاہ ہو گئی ہوں۔

اب تم مجھے اپنے ان خوب صورت الفاظ کی زنجیروں میں نہیں باندھ سکتے۔

خدارا اور کچھ نہیں تو محبت جیسے پاک اور عظیم جذبے کے تقدس کو تو پامال نہ کرو۔

مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ غصے۔۔۔ غم اور کھسیاہٹ کی شدت نے اس کی گویائی سلب کر لی تھی۔

اس پر اپنی بے کسی۔۔۔ بے بسی اور جان خطرے میں پڑ جانے کا احساس اسے کچھ بھی کہنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ دل بھی اس بری طرح دھڑک رہا تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر نکلتا نظر آ رہا تھا اور آنکھوں میں مرچیں سی گھل رہی تھیں۔

"بھئی یہ تو سخت زیادتی ہے اس جان ناتواں' پر یہ فرد جرم لگائے بغیر کسی کو مورد عتاب ٹھہرا دینا۔" وہ اس کی خاموشی سے اکتا کر اس کے کچھ اور بھی قریب ہو کر بولا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے منہ سے نکلا لگاوٹ اور پیار کا ایک ایک لفظ دہکتی ہوئی چنگاریوں کی طرح اسماء کے پورے وجود کو داغے جا رہا ہے۔

پھر اس نے اسماء کے بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا۔

"ہاں تو اب بتاؤ کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کس بات پر اتنی روٹھ گئی ہو کہ شکل تک دیکھنی گوارا نہیں۔ کیا میری اتنے روز کی غیر حاضری پر تو نہیں؟ مگر تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ ابو جی آج کل زمینوں پر گئے ہوئے ہیں اور ان کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے ان کے سارے کاموں کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر آن پڑی ہے۔ سچ کسی کسی دن تو مجھے سر اٹھانے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔" وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش میں خود ہی اپنے سوال کا جواب دے کر گویا اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

وہ اس سے کس قدر قریب کھڑا تھا کہ اس کے مدہوش کن لمس میں لپٹی اس کے لباس سے اٹھتی اس کی پسندیدہ خوشبو سیدھی اسماء کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی لیکن اسماء کو آج اس خوشبو سے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ غم و غصے کی شدت سے اس کا فاقے اور نقاہت زدہ جسم کانپ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے۔

اف اس قدر دھوکا۔۔۔ اتنی مکاری۔۔۔ آخر جھوٹ اور بے ایمانی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ وہ دل گرفتہ سی سوچ رہی تھی کہ اس نے اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کی شکل دیکھی۔

"اوہ بڑی پیلی نظر آ رہی ہو اور کتنی کمزور بھی۔" اس نے اس کے ویران اترے اترے اور کملائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بڑی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ امی جان کہہ رہی تھیں کہ تمہاری طبیعت دو تین روز سے خراب ہے۔ تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں حتیٰ کہ امی جان کے اصرار کے باوجود ڈاکٹر کو دکھانے سے بھی انکار کر دیا اور دوا تک کھانے پر راضی نہیں ہوتیں۔ اس کا مطلب جانتی ہو کیا ہے۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ تم خود کو نہیں مجھے سزا دے رہی ہو۔ مجھے ایذا پہنچا رہی ہو یا پھر مجھ سے۔" اور تبھی اسماء نے اپنی الم انگیز درد و کرب میں ڈوبی۔۔۔ نفرت اور حقارت سے بھرپور غم آلود نظروں کو اونچا کر کے کچھ اس انداز سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ بات کرنی

بھول گیا اور کچھ اس طرح سٹپٹا گیا کہ اس سے نظریں بھی چار نہ کر سکا اور اپنی بوکھلاہٹ اس کی نظروں سے چھپانے کی غرض سے ہی اس نے منہ موڑ لیا۔ وہ بری طرح بلک اٹھی۔

کہ کبھی یہی شخص اس کی پناہ گاہ تھا۔۔۔ اور یہ فریبی اور جفاکار ہستی اس کی محافظ تھی۔

اس کا پہلا اور آخری پیار تھی۔ دنیا کی ہر شے سے زیادہ اسے عزیز تھی۔ وہ لاکھ جان لینے کے درپے تھا' اس کے قتل کے سامان کر رہا تھا۔

پھر بھی محبت کا پودا جل ضرور گیا تھا۔ مگر اس کی مضبوط جڑیں پوری گہرائی سے اسماء کے دل میں پیوست تھیں۔ کہ محبت کا یہ شعار ہی نہیں ہے۔

وہ تو ایک نرم و گداز۔۔۔ لطیف و رقیق۔۔۔ امین و متین۔۔۔ مقدس اور عظیم اور ہر شے کو اپنے اندر سمو لینے والا جذبہ ہے۔

اور وہ تو اس کی زندگی میں داخل ہونے والا پہلا مرد تھا جسے اس نے دل کی پوری سچائیوں اور گہرائیوں سے بہت ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اور سچ بات تو یہ تھی کہ وہ بھی اس کی اتنی شدید گریہ وزاری سے متاثر ہو کر تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول گیا تھا بلکہ اسے یوں روتے بلکتے دیکھ کر ہراساں ہو گیا تھا۔

دشمنی اور مخالفت ایک طرف۔ وہ بھی انسان تھا اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس نے اس سے اپنی جھوٹی محبت کا ڈھونگ رچا کر اسے اپنی محبت میں گرفتار کیا ہے اور وہ اس سے سچی محبت کرتی ہے۔

"اگر تم کچھ دیر اور یوں ہی روتی رہیں تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ میں بھی تمہارے ان آنسوؤں میں پانی بن کر بہہ جاؤں گا۔۔۔ خدارا اپنے یہ آنسو پونچھ لو اور مجھے بتاؤ کہ تمہیں آخر کیا شکایت ہے' کیا دکھ ہے تمہیں اسماء!" اس نے اشک بار آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر جلد جلد اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"کیا تمہیں اپنے تیمور پر اعتماد نہیں سویٹ ہارٹ۔۔۔ کیا تم اسے نہیں بتاؤ گی۔" اسے پھسلانے کی غرض سے وہ اپنے لہجے میں کچھ زیادہ ہی مٹھاس شامل کر کے بولا۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" آنسو پونچھ کر نظریں جھکا کر اس نے کہنا چاہا۔

"ہاں ہاں کہو۔ اتنی جھجک کیوں رہی ہو۔۔۔" اس نے بے تابانہ کہا۔ مگر جواب میں وہ اس کی طرف دیکھ کر اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ اف کیسی قاتل ادا تھی یہ۔۔۔ وہ نگاہیں چرا گیا۔

"آپ۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا آپ نے مجھ سے کچھ وعدہ کیا تھا۔" بالآخر اس نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

"ہائیں وعدہ۔ مگر کون سا وعدہ۔۔۔ بھئی میں نے تو تم سے بہت سے وعدے کیے تھے اب نہ معلوم تم کون سا وعدہ یاد دلانا چاہ رہی ہو۔" وہ قدم بڑھا کر اس کے نزدیک آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی سی چمک تھی۔ وہ گھبرا کر دوسری طرف گھوم گئی۔

"آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جب ابو امی مجھے بہت یاد آئیں گے تو آپ مجھے فوراً" ملتان پہنچا دیں گے تاکہ میں ان کی تربتوں پر فاتحہ پڑھ سکوں اور ان کے لیے قرآن خوانی کرا سکوں۔" اس نے بہت رک رک کر گویا اس کا وعدہ یاد دلایا۔

"ہوں تو گویا تمہارا یہاں دل نہیں لگا۔ میری موجودگی میں بھی نہیں۔ خیر خیر' مجھے بھی تم سے کوئی شکوہ نہیں۔" وہ یوں بولا جیسے اس کے گھر جانے کی خواہش پر بڑا دل گرفتہ سا ہو گیا ہو۔

"لیکن میں تو صرف چند روز کے لیے وہاں جانا چاہتی ہوں اس کے بعد تو یہیں آ جاؤں گی نا۔" وہ بھی اسے پھسلاتی ہوئی بولی۔

"ارے نہیں نہیں' چند روز کے لیے کیا ہم تو تمہیں ہمیشہ کے لیے پہنچا دیں گے جہاں تم جانا چاہو گی۔ فکر نہ کرو بس ایک دو روز کی تو بات ہے۔۔۔" اتنی بات کہتے کہتے اس کے چہرے پر ایک سفاک سی مسکراہٹ آ گئی اور آنکھوں میں ایک پراسرار سی چمک۔ پھر اس نے پورا حلق پھاڑ کر ملازم لڑکے کو آواز دی۔



"اوئے بلے۔" اور چند لمحے بعد ہی نیا ملازم بلا ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آ گیا۔ تیمور نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر اسے چلے جانے کا اشارہ کیا اور پھر ٹرے کو اس کے بیڈ پر رکھ کر اس کی طرف مڑا۔

"امی کی زبانی سنا کہ تم نے دو روز سے کچھ کھایا پیا نہیں تو اپنی بھی بھوک پیاس اڑ گئی۔ خیر اب تمہارے ساتھ ہی ناشتہ کر لوں گا۔ لو جلدی سے چائے بناؤ۔" وہ اسے شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھاتا ہوا بولا اور پھر خود بھی بیڈ پر ٹک گیا اور وہ جو ابھی تک اس کے اس فقرے کہ ایک دو روز کی تو بات ہے' میں الجھی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بیٹھ کر خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"لو پہلے کچھ کھا لو' خالی پیٹ میں چائے پینی اچھی نہیں ہوتی۔" اس نے دو سلائسوں کے درمیان انڈا رکھ کر وہ سلائس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر پھر ہاتھ کو تھوڑا سا پیچھے کر کے بولا۔

"نہیں میرے ہاتھ سے کھاؤ۔ لو شاباش منہ کھولو۔"

"نہیں پہلے آپ کھائیں پھر میں کھاؤں گی۔" یہ تہیہ کرنے کے باوجود کہ وہ کچھ بھی ہو وہ ناشتہ ضرور کرے گی تیمور کے اس طرح کھلانے پر وہ ٹھٹک سی گئی۔

"اوفوہ! تم تو ایسا ظاہر کر رہی ہو جیسے میں نے اس میں زہر ملا رکھا ہو۔ اتنی بے اعتمادی بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔" وہ اس کے حیلے بہانوں پر جھلا کر بولا۔

تو اس کے کہنے پر اسماء کا دم نکل گیا تھا کہ جیسے اس میں زہر ملا ہوا ہے مگر وہ سلائس اس کے ہونٹوں کے قریب کیے گویا کھلانے پر مصر تھا یعنی اب اسماء کے لیے کوئی مفر ہی نہ تھا۔ چار و ناچار اس نے ڈرتے جھجکتے منہ کھول ہی دیا اور تھوڑا سا سلائس دانتوں سے کاٹ کاٹ کر آہستہ آہستہ کھانے لگی کیونکہ اتنے دن کچھ نہ کھانے کی وجہ سے اس کے جبڑے درد کر رہے تھے۔

"سنو! ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو پھر کوئی بھی رشتہ یا جذبہ پنپ ہی نہیں سکتا۔ تم اگر مجھ پر سے اعتماد کھو دو گی تو پھر۔۔۔" باقی فقرہ اس نے ہنس کر سلائس کا ایک بائیٹ لینے میں ہضم کر لیا۔ پھر بہت اصرار کر کر کے وہ اسے ناشتہ کراتا رہا اور چائے پینے کے بعد رسٹ واچ میں وقت دیکھ کر وہ اٹھتا ہوا بولا۔

"اب کھانا کھانے سے انکار نہ کرنا۔ امی جان نافرمانی کرنے والے کو بالکل پسند نہیں کرتیں اور تم نے انہیں پہلے ہی ناراض کر رکھا ہے۔" پھر اس کی طرف دیکھ کر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"ویسے تو تمہیں سوائے نقاہت اور گھبراہٹ کے کوئی بیماری نہیں ہے لیکن امی جان اگر تمہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیں تو انکار نہ کرنا خواہ بعد میں دوا نہ کھاؤ اور ہاں آج دودھ ضرور پی لینا۔ امی جان اتنے پیار سے تمہارے لیے دودھ لاتی ہیں تم انکار کر دیتی ہو تو ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سمجھ گئیں نا۔۔۔ دودھ۔" اور پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اسے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور وہ اس کی باتوں پر' اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتی رہ گئی۔ اگر اس رات اس نے اس کی اور تائی کی گفتگو نہ سنی ہوتی تو وہ آنکھیں بند کر کے اس کی اتنی لچھے دار باتوں پر ایمان لے آتی۔

ٹرے میں چائے کے جھوٹے برتن ابھی تک اس کے آگے بیڈ پر رکھے ہوئے تھے۔

تھوڑا سا ناشتہ اس کی بھوک اور نقاہت میں کوئی فرق نہیں ڈال سکا تھا۔

لیٹنے کے ارادے سے اس نے ٹرے اپنے بستر سے اٹھا کر کھڑکی کے نیچے رکھی تپائی پر رکھی اور جوں ہی سیدھی ہوئی اس کی نگاہ نہایت غیر ارادی طور پر کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کے منظر پر پڑی تو رکھی ہاتھ میں سبزی کا تھیلا لیے تھوڑے فاصلے پر بنی روش پر بڑی پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتی نظر آئی اور اسے دیکھتے ہی مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گویا امید کی ایک کرن سی چمکی تو اس نے گرل کو پکڑ کر بیتابانہ رکھی کو پکارا تو وہ جلدی سے بھاگ کر کھڑکی کے نیچے آ کھڑی ہوئی اور تھیلا ایک طرف کیاری میں رکھ کر اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش میں

پوچھا۔

"اندر کوئی ہے تو نہیں۔"

"نہیں ماسی! مگر تم اتنے دن سے کہاں غائب تھیں۔ میں تو تمہارا انتظار ہی کرتی رہی۔" اسماء نے کہا۔

مگر رکھی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ سخت عجلت اور گھبراہٹ میں تھی اور بار بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ بڑے رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"مینوں ایسا لگدا ہے کوچھ ہون والا ہے تیرے نال ـــ وہ فتح علی آج کل وڈے چکر لگا رہا ہے۔"

"کون فتح علی؟" اس نے پوچھا۔

"ملکانی دا را ـــ بڑا پیڑا بندہ ہے ـــ کڑیوں اور چرس دا دھندہ کردا اے۔ چھوٹی ملکانی نوں وی ایہی پھڑ کے لے گیا سی۔"

"چھوٹی ملکانی نوں۔"

"آہو تیری امی زرین بی بی نوں۔"

"نہیں نہیں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" اسے رکھی کی اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا۔ جی تو چاہا اسے بری طرح لتاڑ دے مگر ایک بالکل ہی انوکھی اور نرالی بات کہی تھی اس نے اس لیے وہ بری طرح الجھ کر رہ گئی۔

"نہیں رب دی سوں ـــ میں جھوٹ نئی بول رئی ـــ اسی بات پر تے چھوٹا ملک پستول کڈھ کے کھڑا ہویا سی تیمور دے اتے۔" رکھی نے مزید انکشاف کیا تو اسے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ تیمور نے بھی تو ایسے ہی کسی جھگڑے کا ذکر کیا تھا اس نے سوچا۔

"رات وہ کچھ ایسی ہی گلاں کر ریا سی ملکانی دے نال۔" رکھی نے مزید بتایا۔

"کیسی۔" اس نے اندر ہی اندر دہل کر پوچھا۔

"وہ ملکانی سے کہہ ریا سی جہر دینے سے کوئی فیدہ (فائدہ) نہیں۔ کڑی نوں میرے نال سندھ بھیج دو۔ ایمان نال میں نے اپنے کناں نال سنا ہے۔" رکھی نے بتایا۔

"نہیں نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ ماسی خدارا تم مجھے یہاں سے نکلوانے کی کوئی ترکیب کرو۔ اگر تمہاری جیراں کی زندگی اور عزت خطرے میں ہوتی تو کیا تم اسے یونہی لٹتے اور مرتے دیکھتے رہتیں۔ بولو ماسی کیا تم مجھے اپنی بیٹی نہیں سمجھتیں ـــ اس روز تم کہہ رہی تھیں کہ تم نے میرے ابو کا بھی نمک کھایا ہے اس لیے مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے پھر تم مجھے یہاں سے نکالنے میں میری مدد کیوں نہیں کرتیں۔"

مگر اس کی عاجزانہ اور ملتجی سی بات کا رکھی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کھڑکی سے ہٹ کر سبزی کا تھیلا اٹھایا اور ادھر ادھر دیکھ کر کچھ سوچتی رہی پھر اس نے اس سے نگاہ ملائے بغیر کہا۔

"میری وس وچ ہوندا تے میں تینوں کدوں دا بھگا چھڈ دی ـــ پر توں گھبرائی میں کل راتی کسی ویلے تیرے پاس آواں گی۔" اپنی بات کہہ کر رکھی تیزی سے کھڑکی کے پاس سے ہٹی اور روش پر چلتی ہوئی عقبی سمت کہیں غائب ہو گئی۔

اور رکھی کے یوں نگاہیں چرا کر چلے جانے پر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ رکھی محض اس کا دل رکھنے کو جھوٹی تسلی دے کر گئی ہے اف یہاں آ کر کس مصیبت میں پھنس گئی تھی وہ۔ اس نے فتح علی کو دیکھنا تو درکنار اس کے بارے میں کبھی سنا بھی نہ تھا مگر رکھی نے جو کچھ بتایا تھا، کچھ غلط نہیں بتایا تھا۔ اسے رکھی پر اتنا تو اعتماد تھا کہ وہ کبھی اس کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اور پھر پرانی ملازمہ ہونے کی وجہ سے تمام واقعات کے چشم دید گواہ بھی تھی۔

جان جانے کا خدشہ ہی کیا کم تھا کہ عزت لٹنے کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ جانے ان ظالموں نے میرے خلاف اب کون سا منصوبہ بنایا ہے اس سے تو اچھا تھا کہ یہ لوگ پہلے دن ہی مجھے اکٹھا زہر دے کر مار دیتے کاش میں اس وقت تیمور سے صاف صاف کہہ دیتی کہ مجھے تمہاری سازشوں کا علم ہو گیا ہے۔ جب وہ کرید کرید کر پوچھ رہا تھا کہ آخر تم کو کیا تکلیف ہے کیا دکھ ہے ـــ اف مارے پریشانی کے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑتے جا رہے تھے۔

پھر جانے دوپہر کو کب اس کا کھانا آیا اور اس نے کیا کھایا؟ اسے کسی بات کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ اس خطرناک صورت حال سے نمٹنے اور یہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچتے سوچتے شام ہو گئی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا تھا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور کتنی دیر ہو گئی تھی اپنی پریشانی کا حل تلاش کرتے کرتے کہ دفعتاً دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے اپنے پریشان کن اور پراگندہ خیالوں سے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ناصرہ بیگم دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے اندر داخل ہو رہی تھیں اف پھر وہی دودھ ـــ اس نے لرز کر سوچا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"لو ـــ میں نے سوچا کھانا تو تم کھا نہیں سکتیں کم از کم یہ دودھ ہی تمہیں پلا دوں۔" ناصرہ بیگم نے اس کے نزدیک آ کر بہت مسکراتے ہوئے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں کوئی چیز پچتی ہی نہیں تائی اماں! تو پھر کیسے کچھ کھا اور پی سکتی ہوں۔" اس نے مضمحل سے لہجے میں کہا۔ دل تو اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔

"ہائے کیا ہوا میری بچی کو ـــ میرے خیال میں تو کسی کی نظر لگ گئی ہے تب ہی تو آپ ہی آپ بیمار ہو گئی ہے۔" انہوں نے اس کے بالکل نزدیک ہو کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔ مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"لے میری بچی ضد نہ کر، یہ دودھ پی لے شاباش۔ بالکل کملا کر رہ گئی تو تو اتنی سی بیماری سے۔ اصل میں کھاتی جو نہیں ہے۔" انہوں نے جھک کر دوسرے ہاتھ سے گلاس اس کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا مگر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"لو بھئی، اب پی بھی لو کسی طرح ـــ اپنی تائی اماں کی بات بھی نہیں مانو گی تم۔"

"نہیں، نہیں ـــ" اس نے ہونٹ بھینچے بھینچے منہ ذرا سا پیچھے کرنے کی کوشش میں کہنا چاہا۔ مگر انہوں نے اس کے سر پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ سے سختی سے اس کے سر کو جکڑ لیا تھا۔

"لے پی ـــ جلدی پی ورنہ میں زبردستی پلاؤں گی۔ بھی۔" ناصرہ بیگم کے لہجے میں ایک دم ہی غراہٹ شامل ہو گئی۔

"نہیں تائی جی! یہ دودھ میں ہرگز نہیں پیوں گی، کبھی نہیں پیوں گی۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے گلاس والے ہاتھ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے بڑے ہٹیلے انداز میں کہا۔

"واہ کیسے نہیں پیے گی۔ تیرے تو اچھے بھی پئیں گے یہ دودھ میں بھی آج تجھے پلا کر رہوں گی۔" ناصرہ بیگم نے بڑی دھاندلی دکھاتے ہوئے کہا اور اس کا سر اپنی بانہہ میں جکڑ کر دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت صرف کر کے گلاس زبردستی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اسماء کمزور ضرور تھی کم از کم ناصرہ بیگم کے مقابلے میں تو بالکل سوکھی چھپی ـــ سی مگر یہ اس کی زندگی کا سوال تھا جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ ان سے زور آزمائی کرنے لگی اور یوں اس کا ہاتھ گلاس پر لگا تو گلاس ناصرہ بیگم کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر جا گرا اور سارا دودھ قالین پر ہی نہیں بلکہ اس کے لباس اور پیروں کو بھی تر کر گیا ـــ پھر تو ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔

"ہے ہے بے شرمے ـــ ایہہ کی کیتا سارا کلین (قالین) ناس کر دتا۔ ہائے ہائے میرے کپڑے دی سارے دودھ وچ بھر دتے ایہہ دودھ تے کلین تیری ماں دی حرام دی کمائی دا تے نہیں ہے ـــ رنڈی کی اولاد۔"

اف اتنا سا دودھ گرنے پر تائی نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ وہ اگر اس کے جوتیاں بھی مار لیتیں تو وہ خاموشی سے ان کی مار بھی سہہ لیتی مگر انہوں نے تو اس کی مرحوم اور محترم ماں کو اتنی غلیظ گالی دی تھی کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"زبان سنبھال کر بات کریں تائی۔ اگر آپ نے اب میری امی کو ایک لفظ بھی کہا تو ٹھیک نہیں ہو گا۔" وہ ڈپٹ کر بولی تو ناصرہ بیگم کچھ دیر تو اس کی اتنی دیدہ دلیری سے بات کرنے پر ششدر سی اسے دیکھتی رہیں پھر اس کی گت پکڑ کر بولیں۔

"ہائے ہائے سچ بات سن کر کیسی مرچیں لگ رہی ہیں۔ اری میں کیا ایک دنیا جانتی ہے میرا دیور اسے

کوٹھے سے اٹھا کر لایا تھا اور تو کون سی فواد کی سگی ہے
.....“

اف اب تو انتہا ہو گئی تھی ناصرہ بیگم کی کمینگی اور سفلہ پن کی۔ اسماء تو پہلے ہی ان کی باتوں پر کھول رہی تھی۔ اب انہوں نے اس کی نیک پارسا اور محترم ماں پر اتنی بڑی تہمت لگائی تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔

”بس خبردار جو ایک لفظ بھی کہا تم جتنی نیک پارسا ہو میں بھی جانتی ہوں زیادہ میرا منہ نہ کھلواؤ۔“ وہ تو ابھی یہ بھی جتانا چاہ رہی تھی کہ اسے ان لوگوں کے کرتوتوں کا علم ہو گیا ہے اور یہ بھی کہ اسے کس مقصد سے زہر دے کر مارنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ناصرہ بیگم نے اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے گھونسے اور تھپڑ مار مار کر اس کا زرد زرد چہرہ لال کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی گندی اور غلیظ گالیوں کا ایک ملغوبہ بھی ان کے منہ سے بہہ نکلا۔

اسماء بیچاری تو پہلے ہی ادھ موئی سی ہو رہی تھی ان کے پتھر کی طرح سخت اور ٹھوس ہاتھوں کی تاب نہ لا کر گرنے کو ہی تھی کہ تیمور کمرے میں آگیا۔

”ہائیں ہائیں' امی جان یہ کیا ہنگامہ مچایا ہوا ہے آپ نے۔“ اس نے کمرے میں گھستے ہی اسماء کی یہ درگت بنتے دیکھی تو بھاگ کر ماں کے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ کو پکڑ کر کہا وہ پھولے پھولے سانسوں کے ساتھ چلا کر بولیں۔

”یہ ہنگامہ میں نے نہیں مچایا ہوا ہے بدبخت اور چڑھا اسے اپنے سر پر اور رکھ اسے پلکوں پر بٹھا کے۔ کم بخت نے ایک تو سارا دودھ قالین پر پھینک کر اس کا ستیا ناس مار دیا۔ اس پر مجھے آنکھیں بھی دکھا رہی ہے۔ میں تو جان سے مار دوں گی اسے آج۔“ انہوں نے اسے مارنے کے لیے اپنے ہاتھ تیمور کی گرفت سے چھڑانے چاہے۔ بدبخت کہنے پر تیمور کو تاؤ تو بہت آیا مگر حالات کی نزاکت کے تحت اس نے بڑے تحمل سے کام لے کر ان کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور انہیں پیچھے ہٹاتا ہوا بولا۔

”تو پھر آپ اپنے ہاتھوں کو کیوں زحمت دے رہی ہیں یہ کام تو میرا ہے۔ آپ نے مجھے ہی بلا لیا ہوتا۔ میں تو اس کے سارے کس بل نکال کر رکھ دیتا۔ ہونہہ' پتہ نہیں کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔“ اور پھر اس نے ماں کے بازو کو دبا کر انہیں کوئی مخفی اشارہ کیا اور بولا۔

”بیکار میں اپنا خون جلانے سے فائدہ۔ آیئے میرے ساتھ اندر چلیے۔“

”نہیں نہیں میں کبھی نہیں جاؤں گی میں تو آج اس کا خون پی کر ہی رہوں گی۔“ وہ پھر اسماء کی طرف لپکیں۔

”امی جان! خدا کے واسطے کچھ تو سمجھ داری سے کام لیجئے۔“ تیمور نے کچھ اس انداز میں ماں کو آنکھیں دکھائیں کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا مگر وہ برابر اسماء کو مغلظات سناتی رہیں۔

”بدبخت نے آج بھی دودھ نہیں پیا۔ میں نے زبردستی کی تو ہاتھ مار کر گلاس ہی گرا دیا۔ ذرا دیکھو تو کیسی حرافہ نکلی یہ کتیا۔ میں تو مار مار کے بلا زہر دیئے ہی اسے ختم کر دیتی پر تو نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا ایک دم۔“

”کمال ہے یعنی آپ اسے مار مار کر اپنے ظلم اور زیادتیوں کے عینی گواہ بھی پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ گھر میں نئے پرانے سبھی ملازم رہتے ہیں اور وہ اپنے کان اور آنکھیں بند تو نہیں کر لیتے۔“ تیمور نے ان کی غیر ذمہ دارانہ بات پر جز بز سا ہو کر کہا۔

”مگر یہی احتیاط اور رازداری برتنے میں دو پونے دو ماہ لگ گئے۔ کچھ معلوم بھی ہے۔ تیرے ابو پرسوں سہ پہر کو آ رہے ہیں۔ آج ہی میری ان سے فون پر بات ہوئی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ کرنا ہے ان کے آنے سے پہلے ہی کر لیا جائے۔“

”ٹھیک ہے امی جان میں بھی اب اس آنکھ مچولی کے کھیل سے تنگ آگیا ہوں۔ میں تو اب کل رات کا بھی انتظار نہیں کروں گا صبح ناشتے کے وقت خود جا کر اسے دودھ پلواؤں گا۔“ تیمور خود بھی باپ کے آنے کی خبر سن کر پریشان سا ہو گیا۔

”نہیں' نہیں صبح نہیں رات کو ہی ٹھیک رہے گا اور تجھے کسی جھمیلے میں پڑنے کی ضرورت نہیں میں

خود اسے دودھ پلوا کر رہوں گی۔" ناصرہ بیگم نے کہا۔

"کیا مجھ پر اعتماد نہیں رہا آپ کو جو خود دودھ پلوانے کا کہہ رہی ہیں جب کہ تین دن سے تو ناکام ہی لوٹ رہی ہیں اس کے کمرے سے۔"

"ارے نہیں پتر یہ بات نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ چپ سی ہو گئیں۔

"تو پھر کیا بات ہے؟" تیمور نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"اب اسے زہر نہیں دینا ناں' آج بھی میں دودھ میں زہر نہیں بے ہوشی کی دوا ملا کر لے گئی تھی۔ فتاں کہہ رہا تھا کہ اس دوائی سے انسان دو تین دن تک بیہوش رہتا ہے۔" آخری فقرہ انہوں نے بڑی معنی خیزی سے کہا۔

"ہوں تب تو وہ دوا بھی مامے نے ہی لا کر دی ہو گی۔" تیمور نے چبھتے سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں تے فیر کیا تیرا پولا کر دیتا۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"مگر یہ ایک دم ہی پروگرام بدلنے کی کیا ضرورت پڑ گئی آپ کو۔"

"تو جو بار بار کہتا ہے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے کسی کو جان سے مار دینا تو میں نے یہی سوچا کہ مارنے سے تو اچھا ہے کہ اسے فتاں کے سپرد کر دیا جائے پھر وہ چاہے اسے مارے یا بیچ دے اس کی مرضی۔ کم از کم ہمارے سر سے تو بلا ٹل جائے گی۔" وہ اپنی دانست میں گویا بڑی کار کردگی دکھاتی ہوئی بولیں۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا یہ کبھی نہیں ہو سکتا امی جان۔" تیمور نے بڑی سختی سے ان کے نئے منصوبے کی مخالفت کی۔

"واہ کیسے نہیں ہو سکتا یہ تو اور بھی آسان ہے۔ اسے بیہوشی کی دوا پلا کر سب سے کہیں گے کہ یہ بیہوش ہو گئی ہے۔ بیمار تو پہلے ہی سے تھی اور اسی بہانے اسے ہسپتال لے جائیں گے آگے جو ہو گا وہ فتاں خود سنبھال لے گا۔ ادھر سب سے کہہ دیں گے کہ وہ خود ہی کہیں بھاگ گئی ہے۔"

"جی ہاں اور سب تو الو کے پٹھے ہیں آپ کے خیال میں جو اتنی آسانی سے آپ کے بھائی صاحب کے دیئے ہوئے جھانسے میں آجائیں گے۔ خاص طور پر ابو جی۔۔۔ اور پھر اگر وہ زندہ رہی تو کبھی نہ کبھی ضرور لوٹ کر آئے گی یا نہ بھی آسکی تو اپنے حصے کا دعویٰ ضرور کرے گی۔ یہ تو سوچا ہی نہیں آپ نے اپنے بھائی صاحب کی غلط سلط مشوروں میں آکر۔"

"ارے نہیں ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ سمجھا تو پتر۔۔۔ اور اب میں تیری اس ٹال مٹول میں بھی نہیں آؤں گی میں تو بس وہی کروں گی جو میرا ویر کہہ رہا ہے۔" ناصرہ بیگم نے بیٹے کی بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور بہت فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہو گا کم از کم میرے جیتے جی تو ہو ہی نہیں سکتا اور پھر یہ ہمارا نجی معاملہ ہے اس میں مامے کو دخل دینے کا کیا حق پہنچتا ہے کون ہوتا ہے وہ آپ کو اتنے تباہ کن مشورے دینے والا۔" ان کی بات پر تیمور ایک دم ہی بھڑک اٹھا۔

"وہ میرا ویر ہے' غنڈہ بدمعاش ہے' مگر ہے میرا سگا خون ہی اور وہ میرے اور تیرے بھلے کو ہی مشورے دیتا ہے اور ساری عمر دیتا رہے گا۔ سمجھا اور اب میں تیری کوئی بات نہیں سنوں گی سمجھا تو جو میری مرضی ہو گی وہی کروں گی۔"

"میں بھی دیکھوں گا کیسے کریں گی آپ؟ بلکہ میں تو ایسی نوبت ہی نہ آنے دوں گا ابھی ابھی جا کر اسے گولی سے اڑا دوں گا۔" ماں کی باتوں پر تیمور مشتعل سا ہو کر اپنے کمرے کی طرف دوڑا تو ناصرہ بیگم اس کے پیچھے دوڑیں۔

آج دودھ نہ پینے کے نتیجے میں جس طرح اسماء کو ذلیل و خوار کیا گیا تھا اور جیسے درگت بنائی گئی تھی اس کے بعد اب اس گھر میں اس کا ایک منٹ بھی ٹکنا کسی طور ممکن ہی نہیں تھا۔ یقیناً "آج دودھ میں سارا زہر گھول کر لائی ہوں گی تائی جی تبھی تو اس کے گرنے پر آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔ بہرحال جب تمہارے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ اسماء تم ان لوگوں کے ہاتھوں سسک سسک کر مرو تو اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ تم ایک دفعہ ہی ساری مقدار کھا لو۔ اف تم نے کتنی بزدلی کی ہے دودھ نہ پی کر۔ دماغ نے ملامت کی۔ مگر نہیں نہیں۔ دل نے فوراً" ہی اس کے دماغ کی نفی کی۔ اس قدر حسرتناک اور بے بسی کی موت تو خدا دشمن کو بھی نہ دے اور پھر کوئی بیوقوف سے بیوقوف یا دلیر سے دلیر بھی ایسی کبھی حماقت نہیں کر سکتا کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گلے پر چھری پھیرے یا زہر کھا لے۔ نہیں نہیں تمہیں زندہ رہنا ہو گا اسماء۔۔۔ تمہاری ابھی عمر ہی کیا ہے۔۔۔ تمہارے ابھی مرنے کے دن نہیں ہیں چلو اٹھو اور یہاں سے نکلنے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ۔ ہمت باندھو' حوصلہ کرو۔۔۔ اور دل کی اس آواز پر لبیک کہتی اسماء اپنے لاغر اور پھوڑا ہوتے جسم کو سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی کہ جان بچانے کا خیال ہی بڑا حیات افزا ہوتا ہے۔ اس نے بڑھ کر پھرتی سے الماری کھولی۔ کچھ رقم ایک چھوٹے سے جیبی بٹوے میں رکھی تھی' اسے گریبان میں اڑسا اور اپنے پشمینے کا سفید ڈبل پاٹ کا شال نکال کر اپنے گرد جلد جلد لپیٹا اور اللہ کا نام لے کر باہر نکل آئی۔ کچن کا راستہ کوریڈور سے نکل کر جاتا تھا۔ وہ دبے پاؤں بڑی چوکنا اور محتاط سی کوریڈور میں آہستہ آہستہ آگے بڑھی تو تائی کے کمرے کے قریب پہنچتے ہی اسے تائی کی آواز سنائی دی وہ تیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"تو جو بار بار کہتا ہے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے کسی کو جان سے مار دینا تو میں نے یہی سوچا ہے کہ مارنے سے تو اچھا ہے اسے فتاں کے سپرد کر دیا جائے۔" تو ان کی پوری بات سن کر خوف اور دہشت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی اس قدر غالب آگیا کہ اس کے قدم ان کے کمرے کے آگے ہی دروازے پر جکڑ کر رہ گئے۔

ماں کے طعنے دینے اور پھنکارنے پر تیمور آگ بگولا سا ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو غیض و غضب کے عالم میں کسی طرف دھیان دیئے بغیر سیدھا نکلتا ہی چلا گیا۔ اس نے اپنے غصے اور اشتعال میں اس کو دیکھا ہی نہیں مگر اسماء کو اسے دیکھ کر ہی ہوش آیا۔ چاہ ہی رہی تھی کہ جلدی سے بھاگ جائے کہ ناصرہ بیگم جو "نہیں نہیں پتر۔۔۔ ارے سن تو۔۔۔ ٹھہر تو۔۔۔" کہتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی تھیں دروازے سے نکلتے ہی اسماء سے بری طرح ٹکرا گئیں اور پھر اسماء پر نظر پڑتے ہی انہوں نے تیمور کو پکارا جو اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"ارے ہائے تیمور دیکھ۔۔۔ اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔۔۔ ہائے اسے سب معلوم ہو گیا ہے اب تو میں اسے ہرگز زندہ نہ چھوڑوں گی چاہے فتاں مجھ پر لعنت بھیج کر چلا ہی کیوں نہ جائے۔"

"نہیں امی۔۔۔ بس میں ایک منٹ میں آیا' اتنے میں آپ اسے پکڑے یہیں کھڑی رہیں۔" وہ بہت عجلت میں بولا اور پھر جھپ سے کمرے میں گھس گیا۔

مگر ناصرہ بیگم کے سینے میں جو عرصہ دراز سے انتقام کی جو بھٹی سلگ رہی تھی۔ وہ لاوا بن کر پھٹنے کو تھی اور اب تو اس پر ان کا ہر راز کھل چکا تھا اس پر وہ اپنے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو اس قدر بھیانک جرم میں شامل بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے اندر گھستے ہی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ اسے گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئیں اور پھر اسے مضبوطی سے پکڑے پکڑے اپنی الماری کا رخ کیا۔ سیدھے ہاتھ سے الماری کا قفل کھول کر ایک مخفی دراز کھولی اور اس میں سے ایک چھوٹی سی صندوقچی نکال لی مگر صندوقچی کا تالا کھول کر ایک ہی ہاتھ سے پیکٹ اور سرنج نکالنا ممکن نہیں تھا انہوں نے اسے آگے گھسیٹ کر الماری کے دوسرے پٹ سے لگا کر کھڑا کر دیا اور جلد جلد صندوقچی کھول کر کچھ نکالنے لگیں۔۔۔ اس سمے ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور چہرے پر کچھ ایسی خونخواری تھی جیسے کسی زخمی شیرنی کے منہ پر اپنے ایذا پہنچانے والے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

اسماء نے ناصرہ بیگم کو پوری قوت سے پیچھے دھکیلا اور تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی لیکن ناصرہ بیگم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھیں انہوں نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دوسرے ہاتھ سے اسے پکڑ لیا لیکن ہاتھ اوچھا پڑا تھا اس کا شال ہی ان کے ہاتھ آسکا۔۔۔ اور وہ قلانچیں بھرتی ان کے کمرے سے نکل گئی۔ مگر ناصرہ بیگم بھی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ وہ بھی ہاتھ میں سرنج لیے تیمور کو پکارتی اس کے پیچھے دوڑیں تو تیمور گھبرا کر باہر بھاگا۔

اسماء جو سرونٹ کوارٹر کی طرف بنے پچھلے

دروازے سے سڑک پر نکلنے کے بجائے گھبراہٹ اور بدحواسی میں بیرونی دروازے کی طرف جاتی روش پر سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ آگے جا کر روش کے کناروں پر بنی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی باؤنڈری میں شلوار کا پائنچا اٹک جانے کی وجہ سے اوندھے منہ زمین پر جا گری تھی اور ناصرہ بیگم جو خاصی پیچھے رہ جانے کے باوجود اس کے گر جانے کی وجہ سے اب اس کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ سریج ہاتھ میں لیے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ لان کی چار دیواری کی باہر سڑک پر جلتے سرکاری کھمبے کی روشنی جو چار دیواری کے اندر آ کے پھل دار درختوں کو پھاند کر اسی جگہ پڑ رہی تھی۔ اس میں تیمور کو واضح طور پر سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

"امی جان۔۔۔ رک جائیے امی جان۔۔۔" وہ دور ہی سے گلا پھاڑ کر چلایا۔ مگر ناصرہ بیگم کے سر پر تو اس کے خون سوار تھا۔۔۔ انتقام کی آگ میں وہ اندھی ہو رہی تھیں انہوں نے اس کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دی اور آگے بڑھتی رہیں اور وہ بھاگتا ہوا ان کے نزدیک آ گیا۔

"یہ دیکھ رہی ہیں آپ یہ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا امی جان تو اس کی ساری گولیاں میں اپنی کنپٹی میں اتار لوں گا۔" وہ ان سے کچھ فاصلے پر رک کر بولا اور بیٹے کی دھمکی پر ناصرہ بیگم نے آگے بڑھتے ہوئے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ سچ مچ اپنی کنپٹی سے بھرا ہوا پستول لگائے کھڑا تھا۔

اف تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرا رہی تھی۔

وہ ہراساں ہو کر اس کی طرف مڑ گئیں۔

بالکل چپ چاپ۔ مہرلب۔

حیران و پریشان سی۔

سریج اب بھی انہوں نے بڑی احتیاط سے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔

"اس سریج کو پھینک دیجئے امی جان یا پھر لائیے مجھے دے دیجئے۔"

وہ کنپٹی سے پستول لگائے لگائے بولا۔ اس کے لہجے میں تحکم بھی تھا اور دھمکی بھی۔ ناصرہ بیگم نے پہلے سریج کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف اور پھر تھوڑے تامل کے بعد وہ سریج وہیں کیاری میں پھینک دی اور پھر بہت غضب ناک لہجے میں بولیں۔

"تو نے مجھے دھمکی دے کر یہ سریج تو پھنکوا دی ہے لیکن تیمور اتنا سمجھ لے کہ میں تجھے اس نجس لڑکی کے خون سے ہاتھ رنگنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"میں خود بھی اس کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا امی جان۔ نہ میں آپ کے ہاتھ رنگوانا چاہتا ہوں بلکہ میں تو اسے زندگی دینا چاہتا ہوں اس کی خوشیاں لوٹانا چاہتا ہوں۔" تیمور پستول کو کوٹ کی جیب میں رکھ کر ایک زہر خند سے بولا۔۔۔ اور بیٹے کی بات سن کر ناصرہ بیگم سناٹے میں آ گئیں۔

"ہائیں یہ تو کیا بک رہا ہے۔ ذلیل کیا تیرے لیے یہی منحوس لڑکی رہ گئی ہے۔ جس کے باپ کا کچھ پتہ ہے نہ خاندان اور نسب کا۔" انہوں نے اپنے حواس بجا کرتے ہوئے کہا۔

اگر آپ کے خیال میں اس کے باپ اور حسب نسب کا کچھ پتا نہیں تو پھر میرے حسب نسب اور باپ کا بھی نہیں ہو گا کیونکہ یہ میرے سگے چچا کی سگی اور جائز اولاد ہے امی جان۔۔۔ میں اس کے بارے میں باقاعدہ تحقیق کر چکا ہوں۔"

"تجھے یہ سب اس کلموہے اکرم الٰہی نے بتایا ہو گا۔ وہ ہمیشہ سے میرے خلاف ہے۔" ناصرہ بیگم بیٹے کی باتوں پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی ہوئی بولیں۔

"چچا اکرم الٰہی نے تو اب بتایا ہے، مجھے تو برسوں پہلے سے معلوم ہے سب کچھ۔۔۔ ہماری برادری کا کون سا ایسا فرد ہے۔ جو آپ کے کرتوتوں سے واقف نہ ہو۔" تیمور نے یہ کہہ کر جیسے نیزے کی انی ان کے کلیجے کے آر پار کر دی۔

"ہوں تو یہ کہہ کہ تو مجھے اب تک دھوکا ہی دیتا رہا ہے تب ہی تو آج کل آج کل کہہ کر ٹالتا رہا اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا کہ تو مجھے دغا دے رہا ہے تو میں اس حرافہ کو۔"

"چھوڑیں امی جی! کوئی بشر بھی کسی کی جان لینے کی قدرت نہیں رکھتا جب تک خدا کا حکم نہ ہو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی وہ گولیاں اسماء کے دودھ میں ملائیں ہی نہیں جو آپ کے جرائم پیشہ بھائی نے لا کر دی تھی۔ میں تو محض آپ کو دکھانے کو ان گولیوں کا پاؤڈر بناتا تھا اور پھر آپ کی نظر بچا کر اس پاؤڈر کے بجائے کسٹرڈ پاؤڈر کی پڑیاں جو میں پہلے سے بنا کر رکھ لیتا تھا' دودھ میں ملا دیتا تھا۔ یقین نہ آئے تو آئیے تب آپ کو یہ بھی دکھا دوں کہ ان زہریلی گولیوں کے پاؤڈر کی کتنی بڑی مقدار میں نے اپنے پاس محفوظ کر رکھی ہے۔"

اف یہ تیمور کہہ رہا تھا۔

اور پھر یہ کہہ کر تو اس نے ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔

یہ صریح دھوکا اور کھلی دغا بازی تھی جو ان کے اپنے سگے اور چہیتے بیٹے نے ان کے ساتھ کی تھی ان کی سٹی گم ہو گئی تھی اور سارا جوش انتقام ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ انتہائی غصے اور کھسیاہٹ کے باوجود ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہہ سکی تھیں۔

"بڑے افسوس کا مقام ہے امی جان۔۔۔ کہ دولت' عزت و وقار اولاد اور دنیا کی ہر نعمت میسر ہوتے ہوئے اس ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی آپ کو دولت کی اتنی ہوس ہے کہ آپ اس بیچاری بے گناہ اور یتیم و یسیر لڑکی کی جان لینے پر تلی ہوئی تھیں۔" بیٹا اب لعنت ملامت پر اتر آیا تھا اس کے لہجے میں جو ایک حقارت اور طنز سا شامل تھا اس نے مہرلب اور شکست خوردہ ماں کو کھولا کر رکھ دیا۔

"او نصیبوں جلے بے غیرت میرا صبر نہ سمیٹ۔۔۔ تو اس کی محبت میں ماں کا ادب احترام بھی بھول گیا ہے۔۔۔ نہ جانے کس کی اولاد ہے یہ۔" لیکن تیمور نے ان کے فقرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور درمیان سے ہی ان کی بات کاٹ کر نہایت جذب کے عالم میں بولا۔

"نہیں۔۔۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔۔۔ بہتان ہے چچی جیسی پاکباز اور پاک طینت خاتون پر۔"

"ارے چل بدبخت۔"

"بس بس آگے ایک لفظ بھی نہ کہیے گا۔ میں شروع سے آخر تک ساری معلومات رکھتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا رویہ شروع ہی سے چچا چچی کے ساتھ سخت جارحانہ تھا اور آپ نے اپنے اس اوباش بھائی کے ذریعے انہیں مروانے کی کوشش بھی کی تھی اور یہ بھی کہ آپ کے دونوں غنڈے بھائیوں نے چاچی جی کو اغوا کیا تھا اور چاچا جی نے محض آپ سے اگلوانے کے لیے میری کنپٹی پر پستول رکھا تھا وہ بھی آپ کے ہاتھ سے لے کر اور آپ نے یہ محض سب اس لیے کیا تھا کہ چاچا چاچی کے حق پر قبضہ کر کے بیٹھ جائیں اور چاچا' چاچی کو گھر سے نکلوا کر آپ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہیں لیکن امی جی! آپ نے کیسا ظلم توڑا ہے چاچا' چاچی اور میرے ابو پر کتنا ستم ڈھایا ہے ان بے چاروں پر کہ پوری زندگی انہیں ملنے ہی نہیں دیا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ترستے اور تڑپتے ہی رہ گئے۔"

"ہاں ہاں میں تو ہوں ہی ہر بات کی قصوروار اور ذمہ دار۔ میں نے ظلم ڈھائے ہیں تیرے ہوتوں سوتوں پر بدبخت۔ میرے منہ پر بھی اتنے بڑے بڑے الزامات لگا رہا ہے جانے کس مردود نے میرے خلاف تیرے کان بھرے ہیں۔" پول کھلنے پر وہ تلملا اٹھیں۔

"کیوں کیا چاچا کے رحلت کر جانے کا تار آپ نے ابو سے نہیں چھپایا تھا حتیٰ کہ چاچی کا وہ خط بھی جو بیوگی کے بعد انہوں نے ابو کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ پھاڑ ڈالا تھا۔ پھر مجھے الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر ماتان اپنے بھائی کے جرائم پیشہ دوست کے پاس بھیج دیا تھا اور کیا آپ اسماء کو سلو پوائزننگ کرنے کی کوشش نہیں کر رہی تھیں۔ کم از کم آپ ان باتوں کو تو نہیں جھٹلا سکتیں نا۔۔۔ ان کا چشم دید گواہ تو میں خود ہوں امی جان۔" ناصرہ بیگم نے لاکھ بیچ میں بولنا چاہا مگر تیمور نے انہیں بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"ہائے میرے دشمنوں کی حمایت میں تو میرے خلاف اتنا زہر اگلے گا بے غیرت نمک حرام میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" ناصرہ بیگم قائل ہونے والوں میں سے نہ تھیں۔ وہ کف دست ملتی ہوئی الٹی اسے ہی لعنت ملامت کرنے لگیں۔

"میں نے اپنے باپ کا نمک کھایا ہے آپ کا نہیں میں جان نمک حرام اور لیجے تو آپ کے بھائی صاحبان ہیں جو ابو کے ٹکڑوں پر پل کر ہمیشہ ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں میں تو یہ سوچ سوچ کر شرمندہ اور شرمسار ہوتا ہوں کہ میں نے ایک مردہ ضمیر ماں کے یہاں کیوں جنم لیا اس سے تو بدرجہا بہتر ہوتا کہ میں کسی غریب اور باضمیر عورت کے یہاں جنم لیتا جو محنت مزدوری کرکے مجھے روکھی سوکھی کھلاتی اور قناعت کا سبق دیتی۔" تیمور کے چھوٹے منہ سے نکلی اتنی بڑی بات نے ایک بار پھر ناصرہ بیگم کو گنگ سا کر کے رکھ دیا۔

وہ سناٹوں کے ہجوم میں ساکت سی کھڑی رہ گئیں۔ کہ اب ان کے پاس کہنے کو باقی کیا رہا تھا۔

وہ تو خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں بری طرح پھنس گئی تھیں۔ اپنی بات کہہ کر تیمور تیزی سے اسماء کی طرف گھوما اور کیاری کی گیلی گیلی سی زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسماء کو سیدھا کیا۔ اس قدر شدید خوف و ہراس اور نقاہت کو اسماء برداشت نہیں کر سکی تھی گرتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ تیمور نے اس پر جھک کر دیکھا۔ کسی نوکیلے پتھر سے ٹکرا جانے کی وجہ سے اس کی پیشانی پر ہلکا سا زخم آگیا تھا جس سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔ تیمور دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ نہ معلوم کیا سمجھا تھا۔ اس نے جلدی سے اسماء کو بانہوں پر اٹھایا اور اس کے رخسار پر اپنا چہرہ ٹکا کر بولا۔

"اوہ میری جان ــــ میری روح ــــ میں نے تم کو کتنے دکھ دیئے ہیں، کتنی اذیتوں سے دوچار کیا ہے۔ میں تم کو ایک چھوٹی سی خوشی بھی نہ دے سکا ــــ مجھے معاف کر دو ــــ معاف کر دو ــــ" ادھر بیٹا یہ کہہ رہا تھا اور ادھر ناصرہ بیگم نے وہ سرنج جھک کر اٹھالی تھی جو ان سے چند قدم کے فاصلے پر کیاری میں پڑی تھی اور آنکھوں میں ایک فاتحانہ اور انتقامی سی چمک لیے وہ اسماء پر وار کرنے بڑھی ہی تھیں کہ دفعتاً تیمور اس کو بانہوں پر اٹھائے ان کی طرف گھوما۔

"ایک بات یاد رکھیں امی جان! اگر خدانخواستہ اسماء کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کے بھائیوں اور ان کی ایک ایک ــــ حتیٰ کہ آپ کو بھی جان سے مار دوں گا۔" اف یہ کہہ کر تو اس نے ان کا یہ آخری وار بھی ناکارہ بنا دیا تھا ان کا اٹھتا ہوا قدم وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا اور سرنج والا ہاتھ بھی نیچا ہو گیا اور دل ہی دل میں اپنی اس آخری شکست کا نوحہ کرتی سن سی کھڑی رہ گئیں۔

"یہ آپ کے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں امی جان ــــ حرص و طمع کرنے کے نہیں کہ کوئی بھی اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاتا۔ جائیے اب اپنے کمرے میں آرام کریں۔" اس نے ان کے دل پر مزید ایک چرکہ لگایا اور پھر اسماء کو بانہوں پر اٹھائے اپنی کار کی طرف بڑھا تھا جو بیرونی روش پر سامنے ہی کھڑی تھی اور ناصرہ بیگم یوں ہی ساکت اور جامد سی گم صم سے کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہیں البتہ ان کی آنکھوں میں اپنی ناکامی کی نہیں بلکہ ندامت، پچھتاوے اور غم کی امنڈتی بدلیاں ضرور ان کے رخساروں پر برسنے لگیں۔ وہ سرے پر پہنچ کر روش پر اترنے لگا تو ایک بار پھر اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا اور ماں کو اسی جگہ کسی بت کی طرح ایستادہ دیکھ کر اس نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

"میں سچائیوں سے مات کھا گیا تھا امی جان! اس لیے مجھے اس قدر گستاخ اور بے ادب ہونا پڑا ورنہ یقین جانیے میرے دل میں اب بھی آپ کا ادب و احترام جوں کا توں موجود ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا کیونکہ اب میں آپ کو مزید شرمندہ اور ناراض کرنے اس گھر میں کبھی نہ آؤں گا۔" اور پھر وہ بڑے بڑے قدم بڑھا کر اسماء سمیت اپنی کار میں جا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے زن سے کار لے اڑا۔

اف جو بچہ بچپن سے ان کے اشاروں پر چلتا رہا تھا۔

بڑے ہو کر بھی اس نے کبھی ان کی کسی بات پر ناں نہیں کی تھی وہ ان کے سامنے باپ کو بھی نہیں گردانتا تھا۔



جوان سے اس قدر شدید محبت کرتا تھا کہ کم ہی کوئی اولاد اپنی ماں سے کرتی ہو گی۔ اور آج امی ــــ بیٹے نے شرم مروت لحاظ اور ادب و احترام سب کچھ بالائے طاق رکھ کر اس کے ظلم و ستم کا پردہ چاک کر دیا تھا۔

اور ان کو ایک شرمناک اور فاش شکست دی تھی۔ ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ وہ خود بھی اندر سے اپنے آپ کو کھوکھلا محسوس کر رہی تھیں۔

بیٹا تو سچ مچ ان کا ظاہری پیرہن ہی اتار کر لے گیا تھا اور اب ان کو اپنا گھناؤنا باطن صاف نظر آ رہا ہے۔

تلاش کرنے اور ٹٹولنے کے باوجود اس گھناؤنے باطن میں نیکی کی ذرا سی رمق بھی تو نہیں نظر آ رہی تھی انہیں۔

اس پر یہ بے موت مار دینے والا احساس کہ ان کا اتنا لاڈلا اور چہیتا جوان بیٹا جس کی وہ والہ و شیدا تھیں، خود ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان پر لعنت بھیج کر چلا گیا تھا۔ وہ اب کبھی خود آئے گا نہ یہ خود اسے بلانے کی جرات کر سکیں گی۔ وہ یہ اپنے دشمنوں کو مات دینے کی نہیں خود اپنی زندگی کی بازی بھی ہار چکی ہیں۔

بیٹے نے کیا طمانچہ مارا تھا ان کی غیرت پر یہ کہہ کر کہ۔

"اب آپ کے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں امی جان! جائیے اب آپ اندر جا کر آرام کیجیے۔" اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ کچھ تو شرم کیجیے امی جان ــــ یہ عمر اور یہ گن ــــ کیا آپ کو خدا کو منہ نہیں دکھانا۔"

اف مردہ ضمیر میں زندگی کی نئی لہر دوڑی تھی تو وہ روح پر اتنا بوجھ بنتا جا رہا تھا کہ ناصرہ بیگم کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں یا پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لیں۔ وہ اپنی شخصیت کے مسخ اور ریزہ ریزہ ہو جانے کا سوگ کچھ اس شدت سے منا رہی تھیں کہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ کہاں کھڑی ہیں اور کیا سوچ رہی ہیں لیکن چند لمحوں بعد ہی ایک دم انہیں ہوش آگیا۔ وہ قدموں کی آہٹیں اور دھیمی دھیمی آوازیں تھیں جنہوں نے

انہیں چونکا دیا تھا انہوں نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ ان سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک طرف صائمہ، سیما اور ایاز اور ان سے تھوڑے فاصلے پر ذرا پیچھے رحمتے، فیضان اور نیا ملازم بلا کھڑے تھے جو شور اور بھاگنے کی آوازیں سن کر اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکل آئے تھے سب کی نظریں ان پر ٹکی ہوئی تھیں مگر کوئی بھی انہیں سہارا دینے نہیں آیا تھا حتیٰ کہ ان کی اولاد بھی اور ان کے لیے یہ احساس بڑا جان لیوا اور روح فرسا تھا کہ ان سب پر بھی ان کی ساری اصلیت ظاہر ہو گئی ہے۔

انہوں نے اپنے بچوں کی طرف ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ ضمیر کے لگائے ہوئے روح کے سارے زخم پھٹ پڑے۔

اف نہیں نہیں۔ اب میں اپنی یہ مسخ شخصیت اور داغدار صورت لے کر اپنے ان بچوں کا سامنا کبھی نہ ــــ کبھی نہ کر سکوں گی کبھی نہیں ــــ انہوں نے پل کے پل میں سوچا۔

اور پھر حک کردہ سرنج جو زمین پر پھینکنے کے باوجود بالکل صحیح و سلامت تھی اپنی پنڈلی پر لگا کر سوئی گوشت میں پیوست کر دی اور پھر وہیں گیلی اور کھاد پڑی زمین پر بیٹھ گئیں۔

اور پھر سرنج میں بھرا قاتل زہر اس سرعت سے اپنا کام کر گیا کہ ان کے بچے جو انہیں زمین پر بیٹھتا دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف لپکے تھے ان سے یوں یکایک گر جانے کا سبب بھی نہ پوچھ سکے۔

جو لوگ کسی سچی اور جائز بات پر بھی قائل نہیں ہوتے یا پھر سرے سے کسی بات پر قائل ہونا ہی نہیں جانتے وہ جب قائل ہوتے ہوں گے تو شاید اسی انداز میں جیسے کہ ناصرہ بیگم ہوئی تھیں۔